

وحدتِ اُمت

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ

مرکزی انجمن خدام القرآن
لاہور

آج مسلمان پوری دنیا میں جس زبوں حالی کا شکار ہیں، اس کا بڑا سبب آپس کا اختلاف و افتراق ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اختلافِ رائے اور افتراق میں فرق کیا جائے اور افتراق کو ختم کیا جائے۔ اس موضوع پر اہم کتاب

وحدانیت

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع علیہ رحمۃ اللہ



مکتبہ مرکزی اہل سنت لاهور



نام کتاب _____ وحدت امت
 پارسوم (مئی ۱۹۹۷ء) _____ ۱۱،۰۰
 ناشر _____ ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
 مقام اشاعت _____ ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۳۷۰۰
 فون : ۳۔ ۵۸۶۹۵۰۱
 مطبع _____ شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور
 قیمت _____ ۸ روپے

تقدیم

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّيْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

منفق پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ دوزمرقہ کا نام نامی اسم گرامی محتاج تعارف نہیں ہے۔ مفتی صاحب مرحوم اپنے علم و فضل، اپنے تقویٰ اور اپنی بالغ نظری و قلبی کی وجہ سے اہل علم کے تمام مکاتیب فکر میں محترم و مکرم تو تھے ہی، عامتہ الناس میں بھی نہایت ہر دل عزیز اور محبوب تھے۔

مولانا مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے تفتہ فی الدین سے مالا مال فرمایا تھا اور ان کے قلب میں اہل سنت کے تمام فقہی مسالک کے متعلق بڑی اعلیٰ ظرفی عطا فرمائی تھی اور مرحوم زبان و قلم سے کوشاں رہے کہ مسلمانوں کی صلاحیتیں اور توانائیاں آپس کے فقہی و فروعی اختلافات میں ضائع ہونے کے بجائے وحدتِ امت کے تصور کو مستحکم کرنے میں صرف ہوں۔ اختلافات جائز حدود تک رہیں، وہ کسی طور پر بھی مخالفت کی صورت اختیار نہ کریں۔

مولانا مرحوم کو اس امر کا شدت سے احساس تھا کہ اختلاف رائے جب مخالفت کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو وحدتِ امت کو شدید صدمہ پہنچتا ہے اور یہ افراق دنیا میں پوری امت کے ذلیل و خوار ہونے کا باعث بنتا ہے۔ مولانا مرحوم پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام و نفاذ میں اہل سنت کے مختلف مکاتیب فکر کی مخالفتوں پر انتہائی کڑھتے تھے۔ ان کی پختہ رائے تھی کہ وحدتِ امت کی جتنی ضرورت پاکستان کے اہل سنت کو ہے، شاید کسی دوسرے مسلم ملک کو اتنی نہ ہو۔

مولانا مرحوم نے قریباً چودہ سال قبل لائل پور (حال فیصل آباد) میں ملک کی ایک شہور
 سلفی المسک (اہل حدیث) جامعہ میں "وحدتِ اُمت" کے موضوع پر بڑی دلسوزی کے
 ساتھ اظہارِ خیال فرمایا تھا۔ ازاں بعد اسی موضوع پر ایک مرتبہ اور بھی تقریر کی تھی۔
 یہ دونوں تقاریر پہلے مکتبہ المنبر فیصل آباد نے، بعدہ دارالاشاعت کراچی نے شائع
 کیں۔ ان تقاریر کے اہم اقتباسات انجمن خدامِ اسلام ٹاؤن شپ لاہور نے ہزاروں
 کی تعداد میں شائع کر کے مسلمانوں تک پہنچائے اور اب بھی پہنچا رہی ہے۔
 اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "وحدتِ اُمت"
 کو وسیع پیمانے پر عوام و خواص، بالخصوص اہل علم کے حلقے تک ایک مہم کے طور پر پہنچانے
 کا اہتمام کیا جائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور اس مفید
 کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع کر رہی ہے۔

(ڈاکٹر) البصائر احمد عفی عنہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكُنْفَىٰ وَسُبْحٰنَہٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

میرے بزرگوں اور دوستوں! یہ امر ایک حقیقت ہے۔ اس میں کسی تواضع کا دخل نہیں کہ ابتداءِ عمر سے نہ کبھی کوئی خطیب رہا نہ واعظ۔ نہ بڑے مجبوں کو خطاب کرنے کا عادی۔ میری پوری عمر پڑھنے پڑھانے میں گزری یا پھر کچھ کاغذ کالے کرنے میں عام مسلمانوں کی ضرورت کے مطابق مختلف رسائل پر تصنیف کا سلسلہ رہا اور میرے بزرگوں نے اپنے حُسنِ ظن کی خدمتِ فتویٰ میرے سپرد فرمادی۔ عمر کا ایک بہت بڑا حصہ اس میں صرف ہوا۔

ہمارے محترم حکیم عبدالرشید اشرف صاحب نے اپنے حُسنِ ظن اور کرمِ فرمائی سے مجھے یہاں لاسٹجا یا اور جو عنوان مجھے کلام کرنے کے لیے حوالہ فرمایا وہ جس طرح اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایسا یقینی اور واضح ہے کہ اس میں دو رائے ہونے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسی طرح ہمارے معاشرے میں اس کا وجود ایسا کیا ہے کہ اپنے معاشرہ کو سامنے رکھتے ہوئے اس موضوع پر زبان کھولنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ مجھے عنوان یہ دیا گیا ہے کہ امتِ اسلامیہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح اور ناقابلِ انکار حقیقت ضرور ہے مگر ہمارے حالات و واقعات دنیا کو اس کے خلاف یہ دکھلا رہے ہیں کہ یہ امت ایک ناقابلِ اجتماع تشدد ہے۔ اپنے حالات و خصوصیات وقت سے صرف نظر کر کے مسئلہ کے دلائل پر بحث ایک نرافلسفہ ہے جس سے ہماری کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ اس لیے مجھے اس مسئلہ کے مثبت پہلو پر کچھ کلام کرنے سے زیادہ اس کے منفی پہلو، افتراق و تشدد اور اس کے اسباب پر غور اور اس کے علاج کی فکر کرنا ہے۔

جہاں تک اسلام کی دعوت اتحاد اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو یکجہ کل انسانوں کو ایک قوم ایک خاندان ایک برادری قرار دینے کا معاملہ ہے وہ کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی مسلمان پر مخفی ہو۔ قرآن کریم کے واضح الفاظ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ میں تمام بنی نوع اور بنی آدم انسان کو ائمتہ المؤمنون اخوة میں مسلمانوں کو ایک برادری قرار دیا گیا۔

حجۃ الوداع کے آخری خطبہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس وقت کے مسلمانوں کے سب سے بڑے اجتماع میں ہدایتی

حجۃ الوداع

اصول ارشاد فرمائے ان میں اس بات کو بڑی اہمیت سے ذکر فرمایا کہ:

”اسلام میں کالے گورے، عربی عجمی وغیرہ کا کوئی امتیاز نہیں۔ رب

ایک مال باپ سے پیدا ہونے والے افراد ہیں۔“

اس ارشاد کے ذریعے جاہلانہ وحدتیں جو نسب اور خاندان کی بنیاد پر یا وطن اور رنگ اور زبان کی بنیاد پر لوگوں نے قائم کر لی تھیں، ان سب کے ثبوتوں کو توڑ کر صرف خدا پرستی اور دین کی وحدت کو قائم فرمایا۔

یہی وہ حقیقی وحدت ہے جو مشرق و مغرب کے تمام بنی آدم اور نوع انسان کے تمام افراد کو متحد کر کے ایک قوم، ایک برادری بنا سکتی ہے اور سعی و عمل کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے۔ نسب اور وطن یا رنگ اور زبان کی بنیاد پر جو وحدتیں اہل جاہلیت نے قائم کر لی تھیں اور آج کی مزعومہ روشن خیالی کے دور میں پھر انہی کی پرستش کی جا رہی ہے۔ ان وحدتوں کی بنیاد پر ہی انسانوں کے طبقات میں تفرقہ ہے اور تفرقہ بھی ایسا جس کو کسی عمل اور کوشش سے مٹایا نہیں جاسکتا۔ جو کالا ہے وہ گورا نہیں بن سکتا۔ جو نسب میں سید یا شیخ نہیں وہ کسی سعی و عمل سے شیخ یا سید نہیں بن سکتا۔

اسلام نے ایک ایسی وحدت کی طرف دعوت دی جس میں تمام انسانی افراد بلا کسی مشقت کے شریک ہو سکتے ہیں اور یہ وحدت چونکہ ایک مالک حقیقی وحدہ

لاشریک لڑکے تعلق اور اس کی اشاعت سے وابستہ ہے۔ اس لیے بلاشبہ ناقابلِ تقسیم ہے :

جو عنوان اس مجلس میں مجھے دیا گیا ہے اس کے مثبت پہلو پر تو اتنی گزارش بھی کافی سمجھتا ہوں۔ مگر اب یہ دیکھتا ہوں کہ یہ ایک عقیدہ اور نظریہ ہے جو زبانوں پر جاری اور کتابوں میں لکھا ہوا ہے، لیکن جب اپنے گرد و پیش ہی نہیں بلکہ مشرق و مغرب کے انسانوں کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو اس کے برعکس یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ ملت ایک تفرقہ ہے۔ جس میں اجتماع کا امکان دُور دُور نہیں۔ وہ ملت جس نے دنیا کے تمام انسانوں کو ایک خدا کی اطاعت پر جمع کر کے ایک برادری بنانے کی دعوت دی تھی :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ

نَفْسٍ وَاحِدَةٍ (سورۃ نسا) اور پھر مسلسل دعوت اور افہام و تفہیم کے باوجود لوگ اس برادری سے کٹ گئے۔ ان کو ایک جداگانہ قوم قرار دے کر خدا تعالیٰ کے ماننے والوں کو حسبِ دستور ایک قوم، ایک ملت، ایک برادری بنا کر بنیان موصوصیہ پلائی ہوئی ناقابلِ شکست دیوار بنایا تھا، آج وہ ملت ہی طرح طرح کے تفرقوں میں مبتلا ایک دوسرے سے بیزار اور برسہا پیکار نظر آتی ہے، اس میں سیاسی پارٹیوں کے جھگڑے نسبتی برادریوں کی تفریق، پیشوں اور کاروبار کی تقسیم، امیر غریب کا تفرقہ تو بنیاد منافرت تھی ہی، زیادہ افسوس اس کا ہے کہ دین اور خدا پرستی غیروں کو اپنا بناتے اور نسبی، نسلی، وطنی اور لسانی تفرقوں کو مٹانے ہی کا نسخہ اکسیر تھا۔ آج وہ بھی ہمارے لیے جنگِ جدل اور عداوتوں اور جھگڑوں کا ذریعہ بن گیا۔ جس نے پوری ملت کو دینی و دنیوی ہر اعتبار سے ہلاکت کے غار میں دھکیل دیا اور اس سے بچنے کا کوئی علاج نظر نہیں آ رہا۔ ہماری ہر تنظیم تفریق اور ہر اجتماع افتراق کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اور یہی وہ روگ ہے، جس نے ملت

اسلامیہ کو اس عظیم الشان عددی اکثریت کے باوجود پسپا بنا یا ہوا ہے۔ ہر قوم ہمیں اپنے میں جذب کرنے کی طمع رکھتی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ پر عقائد سے لے کر اعمال و اخلاق تک، ثقافت و معاشرت سے لے کر معاملات و اقتصادیات تک ہر قوم کی یلغار ہے۔ ایک طرف حکومت اقتدار اور اقتصادیات و تجارت میں ان پر عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا ہے تو دوسری طرف لمحہ انہ تبسیات کے ذریعہ ان کے عقائد و نظریات کو متزلزل اور ان کی خدا پرستی کے اصول کو نئی تعلیم و تہذیب اور خیر خواہی اور ہمدردی کے عنوان سے ہوا پرستی میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ ہمارے عوام انگریز کے ڈیڑھ سو سالہ اقتدار میں مختلف تدبیروں کے ذریعہ علم دین سے محروم اور حقائق سے نا آشنا کر دیے گئے، اب گھر کی دولت علم و فن کو گنوا کر جو کچھ دوسروں کی طرف سے آتا ہے، اسی کو سرمایہ سعادت سمجھنے لگے، خصوصاً جب کہ اس تعلیم و تہذیب کے سایہ میں نفس کی بے لگام خواہشات اور عیش و عشرت کا میدان بھی کھلا نظر آتا ہے اور ہمارے علماء اہل فکر و نظر اپنے جزوی اور مندرجی اختلافات اور بہت سے غیر ضروری مسائل میں ایسے اُلجھ گئے کہ ان کو اسلام کی سرحدوں پر ہونے والی یلغار کی گویا خبر ہی نہیں۔

اسباب مرض اور علاج

آج کی اس مجلس میں ملت کا درد رکھنے والے علماء فضلاء اور مفکرین کا اجتماع نظر آتا ہے، دل چاہتا ہے، ملت کے اس مرض کے اسباب اور اس کے علاج پر کچھ غور کیا جائے

امیر! مجمع ہیں احباب درد دل کہہ لے

پھر التفاتِ دلِ دوستان رہے نہ رہے

سب سے پہلے میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نظری مسائل میں آراء کا اختلاف نہ مضر ہے نہ اس کے مٹانے کی ضرورت ہے، نہ مٹایا جاسکتا ہے۔ اختلاف رائے نہ وحدتِ اسلامی کے منافی ہے نہ کسی کے لیے مضر، اختلاف رائے ایک فطری اور طبعی امر ہے جس سے نہ کبھی انسانوں کا کوئی گروہ خالی رہا نہ رہ سکتا ہے۔ کسی جماعت میں ہر کام اور ہر بات میں مکمل اتفاق رائے صرف دو صورتوں میں ہو سکتا ہے، ایک یہ کہ ان میں کوئی سوچ بوجھ والا انسان نہ ہو جو معاملہ پر غور کر کے کوئی رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اس لیے ایسے مجمع میں ایک شخص کوئی بات کہہ دے تو دوسرے سب اس پر اس لیے اتفاق کر سکتے ہیں کہ ان کے پاس کوئی رائے اور بصیرت ہی نہیں۔ دوسرے اس صورت میں مکمل اتفاق رائے ہو سکتا ہے کہ مجمع کے لوگ ضمیر فردش اور خائن ہوں کہ ایک بات کو غلط اور مضر جانتے ہوئے محض دوسروں کی رعایت سے اختلاف کا اظہار نہ کریں۔

اور جہاں عقل بھی ہو اور دیانت بھی یہ ممکن نہیں کہ ان میں اختلاف رائے نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف رائے عقل و دیانت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو اپنی ذات کے اعتبار سے مذموم نہیں کہا جاسکتا۔ اور اگر حالات و معاملات کا صحیح جائزہ لیا جائے تو اختلاف رائے اگر اپنی حد و دے اندر ہے تو وہ کبھی کسی قوم و جماعت کے لیے مضر نہیں ہوتا بلکہ بہت سے مفید نتائج پیدا کرتا ہے۔ اسلام میں مشورہ کی تکریم اور تاکید فرمانے کا یہی منشا ہے کہ معاملہ کے متعلق مختلف پہلو اور مختلف آراء سامنے آجائیں تو فیصلہ بصیرت کے ساتھ کیا جاسکے۔ اگر اختلاف رائے مذموم سمجھا جائے تو مشورہ کا فائدہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔

صحابہ و تابعین میں اختلاف رائے اور اس کا درجہ

انتظامی اور تجرباتی امور میں تو اختلاف رائے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں آپ کی مجلس میں بھی ہوتا رہا اور خلفاء راشدین اور عام

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد میں امور استقامت کے علاوہ جب نئے نئے حوادث اور شرعی مسائل سامنے آئے جن کا قرآن و حدیث میں صراحتاً ذکر نہ تھا۔ یا قرآن کی ایک آیت کا دوسری آیت سے یا ایک حدیث کا دوسری حدیث سے بظاہر تعارض نظر آیا اور ان کو قرآن و سنت کی نصوص میں غور کر کے تعارض کو رفع کرنے اور شرعی مسائل کے استخراج میں اپنی رائے اور قیاس سے کام لینا پڑا تو ان میں اختلاف رائے ہوا جس کا ہونا عقل و دیانت کی بنا پر ناگزیر تھا۔

اذان اور نماز جیسی عبادت میں جو دن میں پانچ مرتبہ میناروں اور مسجدوں میں ادا کی جاتی ہیں ان کی بھی جزوی کیفیات میں اس مقدس گروہ کے افراد کا خاصا اختلاف نظر آتا ہے۔ اور اس کے اختلاف رائے پر باہمی بحث و مباحثہ میں بھی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ ایسے ہی غیر منصوص یا مبہم معاملات حلال و حرام، جائز و ناجائز میں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آراء کا اختلاف کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں، پھر صحابہ کرام کے شاگرد حضرات تابعین کا یہ عمل بھی ہر اہل علم کو معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی جماعت کسی صحابی کی رائے کو اختیار کر لیتی تھی اور کوئی ان کے مقابل دوسری جماعت دوسرے صحابی کی رائے پر عمل کرتی تھی لیکن صحابہ و تابعین کے اس پورے خیر القرون میں اس کے بعد ائمہ مجتہدین اور ان کے پیروؤں میں کہیں ایک واقعہ بھی اس کا سننے میں نہیں آیا کہ ایک دوسرے کو گمراہ یا فاسق کہتے ہوں یا کوئی مخالف سنت اور گروہ سمجھ کر ایک دوسرے کے پیچھے اقتداء کرنے سے روکتے ہوں یا کوئی مسجد میں آنے والا لوگوں سے یہ پوچھ رہا ہو کہ یہاں کے امام اور مقتدیوں کا اذان و اقامت کے صیغوں میں قرأت فاتحہ، رفع یدین وغیرہ میں کیا مسلک ہے۔ ان اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدل یا سب و شتم تو ہیں، استہزاء اور فقرہ بازی کا تو ان مقدس زمانوں میں کوئی تصور ہی نہ تھا۔

امام ابن عبدالبر قرطبی نے اپنی کتاب "جامع بیان العلم" میں سلف کے باہمی اختلافات کا حال الفاظ ذیل میں بیان کیا ہے:

عن یحییٰ بن سعید قال ما بوح اهل الفتویٰ یفتون فیحل
 هذا ویحترم هذا فلا یری المحرم المحل هلك لتخلیله
 ولا یوی المحل ان المحرم هلك لتحریمهما (جامع العلم ص ۸۰)
 یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ "ہمیشہ اہل فتویٰ فتوے دیتے رہے۔ ایک شخص
 غیر منصوص احکام میں ایک چیز کو حلال قرار دیتا ہے دوسرا حرام کہتا ہے
 مگر نہ حرام کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جس نے حلال ہونے کا فتویٰ دیا وہ ہلاک
 اور گمراہ ہو گیا۔ اور نہ حلال کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جس نے حرام ہونے کا
 فتویٰ دیا وہ ہلاک اور گمراہ ہو گیا۔"

اسی کتاب میں نقل کیا ہے کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے فقیہہ مدینہ
 حضرت قاسم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مختلف فیہ مسئلہ کے متعلق دریافت کیا تو
 انھوں نے فرمایا کہ ان دونوں آراء میں سے آپ جس پر عمل کر لیں کافی ہے کیونکہ دونوں
 طرف صحابہ کرام کی ایک جماعت کا اسوہ موجود ہے۔ (جامع بیان العلم)

ایک شبہ اور جواب

یہاں اصول دین اور اسباب اختلاف سے ناواقف لوگوں کو یہ شبہ ہو سکتا
 ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شریعت اسلام میں ایک چیز حلال بھی ہو اور حرام بھی ہو
 جائز بھی ہو، ناجائز بھی ہو۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے ایک غلط اور ایک صحیح ہوگی
 پھر دونوں جانب کا یکساں احترام کیسے باقی رہ سکتا ہے جس کو ایک آدمی غلط سمجھتا
 ہے اس کو غلط کہنا عین دیانت ہے۔

جواب یہ ہے کہ کلام مطلق حلال و حرام اور جائز و ناجائز میں نہیں کیونکہ قرآن
 سنت کے منصوصات اور تصریحات کے اعتبار سے کچھ چیزیں واضح طور پر حرام ہیں۔
 جیسے سُود، شراب، جُور، رشوت وغیرہ۔ ان میں دورے نہیں ہو سکتیں اور نہ سلف
 صالحین کا ان میں کہیں اختلاف ہو سکتا تھا، اور ان میں اختلاف کرنا تو دین کے بیانات

اور واضح لفظوں کا انکار کرنا بہ اتفاق امت گمراہی اور الحاد ہے اور جو ایسا کرے اس سے بیزاری اور برأت کا اعلان کرنا عین تقاضا کے ایمان ہے۔ اس میں رواداری ممنوع ہے۔

یہ رواداری کی تلقین اور اختلاف رائے کے باوجود اپنے مخالف کی رائے کا احترام صرف ایسے مسائل میں ہے جو یا تو قرآن و سنت میں صراحتاً مذکور نہیں یا مذکور ہیں۔ مگر ایسے اجمال یا ابہام کے ساتھ کہ ان کی تشریح و تفسیر کے بغیر ان پر عمل نہیں ہو سکتا یا دو آیتوں یا دو روایتوں میں بظاہر کچھ تعارض نظر آتا ہے ان سب صورتوں میں مجتہد عالم کو قرآن و سنت اور تعامل صحابہ وغیرہ میں غور و فکر کر کے یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اس کا منشاء اور مفہوم کیا ہے۔ اور اس سے کیا احکام نکلتے ہیں۔ اس صورت میں ممکن ہے کہ ایک عالم مجتہد اصول اجتہاد کے مطابق قرآن و سنت اور تعامل صحابہ وغیرہ میں غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ خلال کام جائز ہے اور دوسرا عالم مجتہد ان ہی اصولوں میں پورا غور و فکر کر کے اس کے ناجائز ہونے کو صحیح سمجھے۔ ایسی صورت میں یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجر و ثواب کے مستحق ہیں۔ کسی پر کوئی عقاب نہیں۔ جس کی رائے اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحیح ہے اس کو دوسرا اجر و ثواب اور جس کی صحیح نہیں اس کو ایک اجر ملے گا۔ اسی سے بعض اہل علم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اجتہادی اختلافات میں دونوں متضاد قول حق و صحیح ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہیں، تمام احکام، عبادات و معاملات سے اللہ تعالیٰ کا مقصد کوئی خاص کام نہیں بلکہ بندوں کی اطاعت و شکراری کا امتحان ہے۔ جب دونوں نے اپنی اپنی غور و فکر اور قوت اجتہاد و شرائط کے ساتھ خرچ کر لی تو دونوں اپنا فرض ادا کر چکے۔ دونوں صحیح جواب ہیں، مگر جمہور امت اور ائمہ مجتہدین کی تحقیق یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تو ان دونوں میں سے کوئی ایک حق و صحیح ہوتا ہے تو جو لوگ اپنے اجتہاد سے اس حق کو پالیں وہ ہر حیثیت سے کامیاب اور دوسرے اجر کے مستحق ہیں اور جو غلطی و بھروسہ شش کے باوجود اس حد تک پہنچیں تو معذور ہیں ان پر کوئی طاعت نہیں۔ بلکہ ان کے سعی و عمل کا ایک اجر ان کو بھی ملتا ہے۔

ایک اہم واقعہ، اہم نکتہ

ایک اہم واقعہ بھی آپ کے گوش گزار کروں جو اہم بھی ہے اور عبرت نیز بھی۔ قادیان میں ہر سال ہمارا جلسہ ہوا کرتا تھا اور سیدی حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے، ایک سال اسی جلسہ پر تشریف لائے، میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ ایک صبح نماز فجر کے وقت اندھیرے میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت سرکپڑے ہوئے بہت مغموں بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ حضرت کیسا مزاج ہے؟ کہا ہاں! اٹھیک ہی ہے میاں مزاج کیا پوچھتے ہو، عرضائع کر دی۔

میں نے عرض کیا حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں، دین کی اشاعت میں گزری ہے۔ ہزاروں آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشائیر ہیں جو آپ سے مستفید ہوئے۔ اور خدمت دین میں لگے ہوئے ہیں، آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی۔ فرمایا: میں تمہیں صحیح کہتا ہوں، عرضائع کر دی!

میں نے عرض کیا، حضرت بات کیا ہے؟

فرمایا: ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کدو کا دشمن کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حقیقت کی تریح قائم کر دیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں۔ یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا، تقریروں کا اور علمی زندگی کا! اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابوحنیفہؒ ہماری تریح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ مقام لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا، وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔

اور امام شافعیؒ مالکؒ اور احمد بن حنبل اور دوسرے مسالک کے فقہاء جن کے مقابلے میں ہم یہ تریح قائم کرتے آئے ہیں کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو صواب محتمل الخطا اور درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے، ثابت کر دیں اور دوسرے کے مسلک کو "خطا محتمل الصواب"۔

(غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں
ان تمام بحثوں، تدقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں۔

پھر فرمایا:

ارے میاں اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کونسا مسلک صواب تھا اور
کونسا خطا؟ اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، دنیا
میں بھی ہم، تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح، یا یہ کہ یہ صحیح
ہے۔ لیکن احتمال موجود ہو کہ یہ خطا ہو اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب
ہو، دنیا میں تو یہ ہے ہی قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترک
رفع یدین حق تھا؟ آمین بالجہر حق تھی یا بالسر حق تھی، برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال
نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہوگا۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یہ تھے:

اللہ تعالیٰ شافی کو رسوا کرے گا نہ ابو حنیفہ کو نہ مالک کو نہ احمد بن حنبل کو، جن کو اللہ
تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے
حصے کو لگا دیا ہے جنہوں نے نور ہدایت چار سو پھیلا یا ہے جن کی زندگیاں سنت کا نور
پھیلانے میں گذریں، اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میلانِ محشر
میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابو حنیفہ نے صحیح کہا تھا یا شافعی نے غلط کہا تھا یا اس
کے برعکس یہ نہیں ہوگا!

تو جس چیز کو نہ دنیا میں کہیں مکھڑا ہے نہ برزخ میں نہ محشر میں، اسی کے پیچھے بڑکے
ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی اپنی قوت صرف کر دی اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی، مجمع علیہ
اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی جو ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں،
جن کی دعوت اہل کرام لے کر آئے تھے، جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا،
اور وہ منکرات جن کو ملنے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی، آج یہ دعوت تو نہیں دی جا رہی
یہ ضروریات دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں اور اپنے دماغی ارباب کے

چہکے کو مسخ کر رہے ہیں اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے ہونا چاہیے تھا، وہ پھیل رہے ہیں، مگر ابھی پھیل رہی ہے، الحاد آ رہا ہے، شرک و بت پرستی چلی آرہی ہے۔ حرام و حلال کا امتیاز اٹھ رہا ہے، لیکن ہم لگے ہوئے ہیں ان فسعی و فروعی بحثوں میں!

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا یوں غلغلیں بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کر دی۔

سلف صالحین میں اختلاف ہوا تو لوگوں کو کیا کرنا چاہیے!

ایسے ہی اختلاف کے متعلق جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

احد القولین خطأ والاشم
فیہ موضوع
متنہاد اقوال میں سے ایک خطا ہے۔ مگر
اس خطا کا گناہ معاف کر دیا
(جامع بیان العلم لابن عبد البر ۱۳ ج ۲) گیا ہے۔

اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے صحابہ کرام کے باہمی اختلافات کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا:

خطأ وصواب فالنظر
فی ذالک۔
ان میں بعض خطا ہیں بعض صواب و صحیح
تو عمل کرنے والے اہل اجتہاد کو غور کر کے
(جامع بیان العلم) کوئی جانب متعین کرنا چاہیے۔

امام مالک نے اپنے اس ارشاد میں جس طرح یہ واضح کر دیا کہ اختلاف اجتہادی میں ایک جانب صواب و صحیح اور دوسری جانب خطا ہوتی ہے دونوں متضاد چیزیں صواب نہیں ہوتیں اسی طرح یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اس اختلاف خطا و صواب میں باہم جھگڑا اور جدال جائز نہیں۔ صرف اتنا کافی ہے کہ جس کو خطا پر سمجھتا ہے اس کو

زہمی اور خیر خواہی سے خطا پر متنبہ کر دے۔ پھر وہ قبول کرے تو بہتر ورنہ سکوت کرے۔
جدال اور جھگڑا یا بدگوئی نہ کرے۔

حضرت امام ربیع کے ارشاد کا پورا قہن یہ ہے:

كان مالك يقول المرء
والجدال في العلم يذهب
بنور العلم من قلب العبد
وقيل له وجب له علم
بالسنة فهو يجادل عنها
قال ولكن ليخبر بالسنة
فان قبل منها والاسكت
(اوجز المسالك شرح مؤلف مالك
ص ۱۵- ۱۶ ج ۱)

حضرت امام نے فرمایا کہ علم میں جھگڑا
اور جدال نورِ علم کو ان کے قلب سے
نکال دیتا ہے۔ کسی نے عرض کیا کہ ایک شخص
جس کو سنت کا علم حاصل ہے کیا وہ حفاظتِ
سنت کے لیے جدال کر سکتا ہے۔ فرمایا کہ
نہیں بلکہ اس کو چاہیے کہ مخاطب کو صحیح بات
سے آگاہ کر دے پھر وہ قبول کرے تو بہتر
ہے ورنہ سکوت اختیار کرے۔ نزاع و جدال
سے پرہیز کرے۔

محمد بن عبدالرحمن صیرفی نے حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے سوال
کیا کہ جب کسی مسئلہ میں صحابہ کرام باہم مختلف ہوں تو کیا ہمارے لیے یہ جائز ہے کہ
ہم ان میں غور و فکر کر کے یہ فیصلہ کریں کہ ان میں صحیح صواب کس کا قول ہے، تو فرمایا:
لا يجوز النظر بين اصحاب رسول
الله صلى الله عليه وسلم
میں لوگوں کو غور و فکر ہی نہ کرنا چاہیے۔

صیرفی نے کہا کہ پھر عمل کس کے قول پر اور کس طرح کریں۔ فرمایا:

تقلد ايهمو شئت۔ ان میں سے جس کا چاہو اتباع کر لو۔

(جامع بيان العلم ۲۷۸ ص ۸۳) یہی کافی ہے۔

اگر مجتہدین کے ان اقوال میں ابو حنیفہ اور مالک رحمہم اللہ کا مسلک تو یہ ہوا کہ
جب صحابہ کرام کے باہم کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو بعد کے فقہاء کو چاہیے کہ دلائل میں

غور کر کے جس کا قول سنت سے زیادہ قریب تر سمجھیں اس کو اختیار کر لیں اور امام احمدؒ کے نزدیک اس کی بھی ضرورت نہیں۔ دونوں طرف جب صحابہ ہیں تو جس کا قول چاہے اختیار کر سکتے ہیں :

حضرت ابی ابن کعبؓ اور عبد اللہ ابن مسعودؓ میں ایک مسئلہ میں باہمی اختلاف ہو رہا تھا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے سنا تو غضب ناک ہو کر باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ انفسوس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں ایسے دو شخص باہم جھگڑ رہے ہیں جن کی طرف لوگوں کی نظریں ہیں اور جن سے لوگ دین کا استفادہ کرتے ہیں پھر ان دونوں کے اختلافات کا فیصلہ اس طرح فرمایا کہ

صدقیٰ ابیٰ ذرؓ و لعلیٰ ابن مسعودؓ یعنی صحیح بات تو ابی ابن کعبؓ کی ہے مگر اجتہاد میں کوتاہی ابن مسعودؓ نے بھی نہیں کی۔

پھر فرمایا کہ مگر میں آئندہ ایسے مسائل میں جھگڑا کرتا ہوں کسی کو نہ دیکھوں، ورنہ اتنی سزا دوں گا۔ (جامع العلم ص ۸۳ ج ۲)

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس ارشاد سے ایک تو یہ بات ثابت ہوئی کہ اجتہادی مسائل و اختلافات میں ایک قول صواب و صحیح ہوتا ہے اور دوسرا اگرچہ صواب نہیں مگر ملامت اس پر بھی نہیں کی جاسکتی۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ایسے اجتہادی مسائل میں خلاف و اختلاف پر زیادہ زور دینا مقتدا یا ان اہل علم کے لیے مناسب نہیں۔ جس سے ایک دوسرے پر ملامت یا نزاع و جدال کے خطرات پیدا ہو جائیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مفصل کلام کو نقل کر کے ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ امام شافعی کے اس کلام میں اس کی دلیل موجود ہے کہ مجتہدین کو آپس میں ایک دوسرے کا تخطیہ نہ کرنا چاہیے۔ یعنی ان میں کوئی ایک دوسرے کو یہ نہ کہے کہ آپ غلطی اور خطا پر ہیں۔ (جامع بیان العلم ص ۳۳ ج ۲) وجہ یہ ہے کہ ایسے اجتہادی مسائل میں کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنے قول کو یقینی طور پر صواب و صحیح اور دوسرے کے قول

کو یقینی طور پر خطاء و غلط کہہ سکتے ہیں اجتہاد اور پورے غور و فکر کے بعد بھی جو رائے قائم کی ہے اس کے متعلق اس سے زیادہ کہنے کا کسی کو حق نہیں کہ رائے صحیح و صواب ہے مگر احتمال خطاء اور غلطی کا بھی ہے اور ہو سکتا ہے کہ دوسرے کا قول صحیح و صواب ہو۔ خلاصہ یہ کہ اجتہادی اختلافات میں جمہور علماء کے نزدیک علم الہمی کے اعتبار سے دو مختلف آراء میں سے حق تو کوئی ایک ہی ہوتی ہے مگر اس کا متعین کرنا کہ ان میں سے حق کیا ہے۔ اس کا یقینی ذریعہ کسی کے پاس نہیں، دونوں طرف خطاء و صواب کا احتمال دائر ہے۔ مجتہد اپنے غور و فکر سے کسی ایک جانب کو راجح قرار دے کر عمل کے لیے اختیار کر لیتا ہے۔

ایک اہم ارشاد

استاذ الاساتذہ سیدی حضرت مولانا سید محمد الوزیر شاہ کشمیری رحمہ سابق صدر مدرس دارالعلوم دیوبند نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اجتہادی مسائل اور ان کے اختلاف جن میں ہم اور عام اہل علم الجھتے رہتے ہیں اور علم کا پورا زور اس پر ختم کرتے ہیں، ان میں صحیح و غلط کا فیصلہ دنیا میں تو کیا ہوتا میرا گمان تو یہ ہے کہ محشر میں بھی اس کا اعلان نہیں ہوگا۔ کیونکہ رب کریم نے جب دنیا میں کسی امام مجتہد کو باوجود خطا ہونے کے ایک اجر و ثواب سے نوازا ہے اور ان کی خطا پر پردہ ڈالا ہے تو اس کریم الکریم کی رحمت سے بہت بعید ہے کہ وہ محشر میں اپنے ان مقبولان بارگاہ میں سے کسی کی خطا کا اعلان کر کے اس کو رسوا کریں۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ جن مسائل میں صحابہؓ و تابعینؓ اور ائمہ مجتہدین رحمہم کا نظری اختلاف ہوا ہے ان کا قطعی فیصلہ نہ یہاں ہوگا نہ آخرت میں، کیونکہ عمل کرنے والوں کے لیے ان میں سے ہر ایک کی رائے پر اپنی ترجیح کے مطابق عمل کر لینا جائز و مسترار دے دیا گیا ہے۔ اور جس نے اس کے مطابق عمل کر لیا وہ فرض سے سبکدوش ہو گیا۔ اس کو جماع امت تارک فرض نہیں کہا جاسکتا۔ ان مسائل میں کوئی عالم کتنی

ہی تحقیقات کرے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کی تحقیق کو یقینی حق و صواب کہا جائے اور اس کے مقابل کو باطل قرار دیا جائے، امام حدیث حافظ شمس الدین رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جس مسئلہ میں صحابہ و تابعین کا اختلاف ہو گیا وہ اختلاف قیامت تک مٹایا نہیں جاسکتا۔ کیونکہ اس کے مٹانے کی ایک ہی صورت ہے کہ ان میں سے ایک گروہ کو قطعی طور پر حق پر اور دوسرے کو یقینی طور پر باطل قرار دیا جائے اور یہ ممکن نہیں ہے۔

اُمم مجتہدین کے اختلاف میں کوئی جانب منکر نہیں ہوتی

مذکورۃ الصدر تصریحات سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس مسئلہ میں صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہو، اس کی کوئی جانب شرعی حیثیت سے منکر نہیں کہلائے گی۔ کیونکہ دونوں آراء کی بنیاد قرآن و سنت اور ان کے مسلمہ اصول پر ہے۔ اس لیے دونوں جانبین داخل معروف ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک کو راجح اور دوسرے کو مرجوح کہا جاسکتا ہے۔ اس لیے ان مسائل مجتہد فیہا میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ بھی کسی پر عائد نہیں ہوتا بلکہ غیر منکر پر نکیر کرنا خود ایک منکر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین کا بے شمار مسائل میں جواز و عدم جواز اور حرمت و حلالیت کا اختلاف ہونے کے باوجود کہیں منقول نہیں کہ ان میں سے ایک دوسرے پر اس طرح نکیر کرتا ہو جیسے منکرات پر کی جاتی ہے یا ایک دوسرے کو یا اس کے متبعین کو گمراہی یا فسق و فجور کی طرف منسوب کرتا ہو یا اس کو ترکِ وظیفہ یا از تکابِ حرام کا مجرم قرار دیتا ہو۔ حافظ ابن عبدالبر نے امام شافعی رحمہ اللہ کا جو قول نقل کیا ہے، وہ بھی اس پر شاہد ہے جس میں فرمایا ہے کہ ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد کا تخطیہ یعنی اس کو خطا دار مجرم کہنا جائز نہیں۔

شرائط اجتہاد

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے جہاں مجتہدین کے آپس میں ایک دوسرے کے تخطیہ

کو نادرست قرار دیا ہے وہیں اس کی معقول وجہ اور ایک شرط کا بھی ذکر کیا ہے۔
ان کی عبارت کا متن یہ ہے :

وفی هذا من قول الشافعیؒ امام شافعیؒ کے کلام میں اس کی دلیل
دلیل علی ترک تخطئتا موجود ہے کہ کوئی مجتہد دوسرے مجتہد کو
المجتہدین بعضهم لبعضی خطا وار نہ قرار دے کیونکہ ان میں سے ہر ایک
اذکل واحد منهم وقد اذی ما نے وہ فرض ادا کر دیا جو اس کے ذمہ تھا۔
كلف باجتہادہ اذا كان متن یعنی اس کے اجتہاد اور قیاس کے شرائط
اجتمعت فیما آلتہ القیاس موجود ہوں اور اہل اجتہاد کے نزدیک اس کو
وكان متن لہ ان یجتہد و اجتہاد و قیاس کا حق حاصل ہو۔
لیقیس (جامع العلم ص ۳، ج ۲)

اس سے معلوم ہوا کہ دو مختلف آراء کا یہ احترام کہ ان میں سے کسی کو منکر نہ کہا جائے
اور اس کے کہنے ماننے والوں کو خطا وار نہ کہا جائے۔ یہ صرف اس صورت میں ہے کہ
اجتہاد صحیح اس کی شرائط کے مطابق ہو۔ آج کل کا سا جاہلانہ اجتہاد نہ ہو کہ جس کو عربی زبان
بھی پوری نہیں آتی اور قرآن وحدیث سے اس کا رابطہ کبھی نہیں رہا۔ اُردو انگریزی
ترجموں کے سہارے قرآن وحدیث پر مشق شروع کر دی۔ ایسا اجتہاد خود ایک گناہ عظیم
ہے اور اس سے پیدا ہونے والی رائے دوسرا گناہ اور گمراہی اور خلاف و تفریق ہے
جس پر تکبر واجب ہے۔

سُنّت و بدعت کی کشمکش میں صحیح طرزِ عمل

ہمارے معاشرے میں مذہب کے نام پر ایک اختلاف وہ بھی ہے جو بدعت و
سُنّت کے عنوان سے پیدا ہوا کہ بہت سے لوگوں نے قرآن و سُنّت کی تعبیر میں اصول صحیح کو
چھوڑ کر ذاتی آراء کو امام بنا لیا اور نئے نئے مسائل پیدا کر دیے۔ اس قسم کے اختلافات
بلاشبہ تفرق و افتراق ہیں، جن سے قرآن و سُنّت میں مسلمانوں کو ڈرایا گیا ہے۔ ان

کے ختم یا کم کرنے کی کوشش بلاشبہ مفید ہے لیکن قرآن کریم نے اس کا بھی ایک خاص طریق بتلایا ہے جس کے ذریعے تفرق کی خلیج کم ہوتی چلی جائے، بڑھتے نہ پائے۔ یہ وہی اصول دعوت الی الخیر ہیں جن میں سب سے پہلے حکمت و تدبیر پھر خیر خواہی و مہمندی اور نرم قابل قبول عنوان سے قرآن کریم کے صحیح مفہوم کی طرف بلا یا ہے اور آخر میں مجاہدہ بالحق ہی احسن یعنی حجت و دلیل کے ساتھ افہام و تفہیم کی کوشش ہے مگر افسوس کہ آج کل عام اہل علم اور صلحین نے ان اصولوں کو نظر انداز کر دیا۔ صرف جدال میں اور وہ بھی غیر مشروطہ انداز سے مشغول ہو گئے کہ اپنے حریف کا استہزاء اور تمسخر اور اس کو زیر کرنے کے لیے جھوٹے، سچے، جائز و ناجائز حربے استعمال کرنا اختیار کر لیا۔ جس کے نتیجے میں جنگ و جدال کا بازار تو گرم ہو گیا مگر اصلاح خلق کا کوئی پہلو نہ نکلا۔

افتراق امت کے اسباب

میں نے اس تمہیدی گذارش کو اتنا طول دینا اور اتنی تفصیل سے بیان کرنا اس لیے گوارا کیا کہ مسلمانوں کے طبقات اہل دین و اصلاح اور دینی خدمات انجام دینے والوں کے مابین جو تفرق آج پایا جاتا ہے وہ عموماً انہی حقائق کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے۔ اب میں ان اسباب و عوامل کو پیش کرتا ہوں جو میرے غور و فکر کی حد تک مسلمانوں میں باہمی آویزش اور شقاق و جدال کا سبب بنے ہوئے ہیں اور افسوس اس کا ہے کہ اس کو خدمت دین سمجھ کر اختیار کیا جاتا ہے۔

عنوان میرے نزدیک اس جنگ و جدال کا ایک بہت بڑا سبب فروعی اور اجتہادی مسائل میں تحریب و تعصب اور اپنی اختیار کردہ راہ عمل کے خلاف کو عملاً باطل اور گناہ قرار دینا اور اس پر عمل کرنے والوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا ہے جو اہل باطل اور گمراہوں کے ساتھ کرنا چاہیے تھا۔ اس پر تمام امت کا اتفاق بھی ہے اور عقلاً اس کے سوا کوئی صورت بھی دین پر عمل کرنے کی نہیں ہے کہ جو لوگ خود درجہ اجتہاد کا نہیں رکھتے، وہ اجتہادی مسائل میں کسی امام مجتہد کا اتباع کریں اور جن لوگوں نے اپنے نفس کو آزادی اور

ہوا پرستی سے روکنے کے لیے دینی مصلحت سمجھ کر کسی ایک امام مجتہد کا اتباع اختیار کر لیا ہے وہ قدرتی طور پر ایک جماعت بن جاتی ہے۔ اسی طرح دوسرے مجتہد کا اتباع کرنے والے ایک دوسری جماعت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر جماعت بندی مثبت انداز میں، صرف اجتہادی مسائل کی حد تک، اپنی تعلیمی اور عملی آسانوں کے لیے ہو، تو نہ اس میں کوئی مضائقہ ہے نہ کوئی تفرقہ اور نہ ملت کے لیے اس میں مضرت۔

حضرت رسال اور تباہ کن ایک تو اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ اپنی رائے اور اختیار سے اختلاف رکھنے والوں کے ساتھ جگ و جدل اور دوسرے ان فروری مسائل کی بحثوں میں غلو کہ سارا علم و تحقیق کا زور اور بحث و تھیس کی طاقت اور عمر کے اوقات عزیزانہی بحثوں کی نذر ہو جائیں۔ اگرچہ ایمان و اسلام کے بنیادی اور قطعی اجماعی مسائل مجروح ہو رہے ہیں۔ کفر و الحاد دنیا میں پھیل رہا ہے، سب سے صرف نظر کر کے، سارا علمی مشغلہ یہی فروری بحثیں بنی رہیں جن کے متعلق مذکورۃ الصدر تفصیل میں ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ ان میں ہزار تحقیقات کے بعد بھی بات اس سے آگے نہیں بڑھتی۔

کہ یہ راجح ہے اور اس کے خلاف مرجوح اور اس راجح مرجوح کا بھی یقینی فیصلہ نہ دنیا میں ہو سکتا ہے نہ برزخ میں ان کا سوال ہو گا نہ محشر میں اس راجح مرجوح کا اعلان ہو گا۔

اسی طرح نہ ان مسائل میں اختلاف رکھنے والوں پر نیکر کرنا درست ہے نہ ان کو خطا کار مجرم ٹھہرانا صحیح ہے۔ اس وقت ہماری قوم کا برگزیدہ ترین طبقہ علماء و فقہاء کا خصوصاً جو تعلیم و تصنیف میں مشغول ہیں، ان کی شبانہ روز مشغولیت کا جائزہ لیا جائے تو بیشتر حضرات کی علمی تحقیقات اور سعی و عمل کی ساری توانائی انہی فروری بحثوں میں محدود نظر آئے گی۔

لمحرف مکریہ

ان میں بعض حضرات کا غلو تو یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ اپنے سے مختلف رائے رکھنے والوں کی نماز کو فاسد اور ان کو تارک قرآن سمجھ کر اپنے مخصوص مسلک کی

اس طرح دعوت دیتے ہیں جیسے کسی منکر اسلام کو اسلام کی دعوت دی جا رہی ہو۔ اور اسی کو دین کی سب سے بڑی خدمت سمجھے ہوئے ہیں۔

معلوم نہیں کہ یہ حضرات اسلام کی بنیادوں پر چاروں طرف سے حملہ آور طوفانوں سے بانجبر نہیں یا جان بوجھ کر انماض کرتے ہیں۔ اس وقت جبکہ ایک طرف تو کھلے ہوئے کفر عیسائیت اور کمیونزم نے پورے اسلامی ممالک اور اسلامی حلقوں پر گھیرا ڈالا ہوا ہے۔ اور یہ دونوں کفر طوفانی رفتار کے ساتھ اسلامی ممالک میں پھیل رہے ہیں صرف پاکستان میں ہزاروں کی تعداد ہر سال مرتد ہو جاتی ہے دوسری طرف کفر نفاق اور الحاد خود اسلام کا نام لینے والوں میں کہیں قادیانیت اور مرزائیت کے لباس میں، کہیں پرویزیت اور انکارِ حدیث کے عنوان سے، کہیں مغرب سے لائی ہوئی اباحت اور تمام محرماتِ شریعہ کو حلال کرنے کے طریقوں سے ہمارے ایمان پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں اور یہ الحاد، کفر و نفاق پہلے کفر سے اس لیے زیادہ خطرناک ہے کہ اسلام اور قرآن کے عنوان کے ساتھ آتا ہے جن کے دم میں سیدھے سادھے جاہل عوام کا تو ذکر ہی کیا ہے ہمارے نو تعلیم یافتہ نوجوان بہ کثرت اس لیے آجاتے ہیں کہ نئی تعلیم اور نئی معاشرت نے ان کو دینی تعلیم اور اسلامی اصول سے اتنا دور پھینک دیا ہے کہ وہ مادی علوم و فنون کے ماہر کہلانے کے باوجود مذہب اور دین کی ابتدائی معلومات سے بھی محروم کر دیے گئے ہیں اور کھلے اور چھپے کفر کی ان ساری اقسام سے بھی اگر کچھ خوش نصیب مسلمان بچ جائیں تو فحاشی، عیانی، ننگے ناچ رقص و سرود کی محفلوں اور گھر گھر ریڈیو کے ذریعہ فلمیں گائوں اور سینماؤں کی زہریلے فضاؤں سے کون ہے جو بچ نکلے۔

اسلام اور قرآن کا نام لینے والے مسلمان آج سارے جرائم اور بد اخلاقیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ہمارے بازار جھوٹ، فریب، سود، قمار سے بھرے ہوئے ہیں اور ان کے چلانے والے کوئی یہودی نہیں، ہندو بنیئے نہیں، اسلام کے نام لیا ہیں۔ ہمارے سرکاری محکمے رشوت، ظلم و جور، کام چوری، بے رحمی اور سخت دلی کی

تربیت لگا ہیں بنے ہوئے ہیں اور ان کے کارفرما بھی نہ انگریز ہیں، نہ ہندو —
 محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ام لینے والے۔ روزِ آخر پر ایمان کا دعویٰ رکھنے والے
 ہیں۔ ہمارے عوامِ علمِ دین سے کورے، جہالتوں میں ڈوبے ہوئے، دین کے فرائض و واجبات
 سے بیگانہ، مشترکانہ رسموں اور کھیل تماشوں کے دلدادہ ہیں۔

اے بسرا پر دہ یثرب بخواب خیز لے کہ شد مشرق و مغرب خراب

ان حالات میں کیا ہم پر یہ واجب نہیں کہ ہم خود و فکر سے کام لیں اور سوچیں کہ
 اس وقت ہمارے آقا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالبہ اور توقع اہلِ علم سے کیا ہوگی؟
 اور اگر محشر میں آپ نے ہم سے سوال کر لیا کہ میرے دین اور شریعت پر اس طرح کے
 حملے ہو رہے تھے، میری امت اس بد حالی میں مبتلا تھی، تم وراثتِ نبوت کے دعویٰ دار
 کہاں تھے؟ تم نے اس وراثت کا کیا حق ادا کیا؟ تو کیا ہمارا یہ جواب کافی ہو جائے گا کہ ہم
 نے رفعِ یدین کے مسئلہ پر ایک کتاب لکھی تھی یا کچھ طلباء کو شرحِ جامی کی بحث حاصل و
 محصول خوب سمجھائی تھی، یا حدیث میں آنے والے اجتہادی مسائل پر بڑی دلچسپ تقریریں
 کی تھیں یا صحافیانہ زورِ قلم اور فقرہ بازی کے ذریعہ دوسرے علماء و فضلاء کو خوب ذلیل
 کیا تھا۔

فردعی اور اجتہادی مسائل میں بحث و تمحیص گو مذموم چیز نہیں، اگر وہ اپنی حد کے
 اندر اخلاص سے اللہ کے لیے ہوتی۔ لیکن جہاں ہم یہ دیکھ رہے ہوں کہ اسلام و ایمان
 کی بنیادیں متزلزل کر دینے والے فتنوں کی خبر ہم سنتے ہیں، اللہ و رسول کے احکام کی خلاف
 ورزی بلکہ استہزاء و تمسخر اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں مگر ہمارے کان پر
 جُڑن تک نہیں ریگتی تو اس کی کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ فرودعی بحثیں ہم اخلاص کے ساتھ
 اللہ تعالیٰ کے لیے کر رہے ہیں۔ اگر ان میں کچھ للہیت اور اخلاص ہوتا تو ہم ان حالات

لے حضورِ سرورِ کونین منداہ ابنِ داحی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس انداز سے خطاب نہ کیا ہی جائز ہو سکتا
 ہے اور جب ایک موحد اپنے الفاظ استعمال کرے گا تو اس سے مراد استغانت و استغناء نہیں ہوگی (۱)

کے تحت اسلام اور دین کے تقاضوں کو پہنچانے اور فرد سے زیادہ اصولِ اسلام کی حفاظت میں لگے ہوئے۔ ہم نے تو گویا علمی اور دینی خدمات کو انہی فروسی مباحث میں منحصر کر رکھا ہے۔ اور سعی و عمل کی پوری توانائی اسی پر لگا رکھی ہے۔ اسلام کے اصولی اور بنیادی مسائل اور ایمان کی سرحدوں کو دشمنوں کی لیٹار کے لیے خالی چھوڑ دیا ہے۔ لڑنا کسی محاذ پر چاہیے تھا اور ہم نے طاقت کس محاذ پر لگا دی۔ انا للہ الخ یہ تو حُزب و تعصب کے غلو کا نتیجہ ہے۔

اسی کے ساتھ دوسری بھاری غلطی ان اجتہادی مسائل میں اختلاف کے حدود کو توڑ کر تفرق و تشتت اور جنگِ جدل اور ایک دوسرے کے ساتھ تمسخر و استہزاء تک پہنچ جانا ہے جو کسی شریعت، ولایت میں روا نہیں، اور افسوس ہے کہ یہ سب کچھ خدمتِ علمِ دین کے نام پر کیا جاتا ہے اور جب یہ معاملہ ان علماء کے مبتدعین عوام تک پہنچتا ہے تو وہ اس لڑائی کو ایک جہاد قرار دے کر لڑتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس قوم کا جہاد خود اپنے ہی دست و بازو سے ہونے لگے اس کو کسی غنیم کی ممانعت اور کفر و الحاد کے ساتھ جنگ کی فرست لیاں۔

قرآن و حدیث میں اسی تجاویز عن الحدود کا نام تفرق ہے جو جائز اختلاف رائے سے الگ ایک چیز ہے، قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہے: **وَاعْتَبِرُوا بِحَسْبِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا**۔ دوسری جگہ اللہ تمہارے لیے کی طرف سے ایک وصیت کا ذکر ہے جو تمام انبیاءِ اقیین کو کی گئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: **أَنْ أَتَمُّوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ** امام تفسیر ابوالعالیؒ نے فرمایا کہ اقامتِ دین سے مراد اخلاص ہے اور **لَا تَتَفَرَّقُوا** کا مطلب یہ ہے کہ آپس میں عداوت نہ کرو، بھائی بھائی بن کر رہو۔

اس وصیت کے بعد قرآن میں نبی اسرائیل کے تفرق کا بیان کر کے اہل اسلام کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ ان کے طریقہ پر نہ جائیں۔ اس میں ارشاد ہے **وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَعِيًّا بَلَّيْتُمْ**۔ حضرت ابوالعالیؒ

نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ لفظ **بَغِيًّا** بَيْتَهُمْ۔ میں اشارہ ہے کہ ایسے اختلاف کا
 عداوت اور جگ و جدل تک پہنچنا کبھی دین کے سبب سے نہیں ہوتا بلکہ بغیا
 علی الدنیا و ملتکھا و زحر فہا و زینتہا و سلطانتہا (جامع العلم
 ص ۲۵) یعنی یہ عداوت جب بھی غور کرو تو اس کا سبب دنیا، حب مال یا حب جاہ
 ہوتا ہے جس کو نفوس و شیطان خدمت دین کا عنوان دے کر مزین کر دیتا ہے ورنہ
 اس طرح کے مسائل میں اختلاف رائے کی حد وہی ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہے، کہ
 مثبت طور پر اپنے عمل کے لیے ایک جانب کو اصلح سمجھ کر اختیار کر لیں اور اس سے
 مختلف مسلک رکھنے والوں سے لڑتے نہ پھریں۔ جس طرح دنیا میں انسان جب بیمار
 ہوتا ہے اپنے معالج کے لیے کسی ایک حکیم یا ڈاکٹر کا انتخاب کر کے صرف اسی کے قول
 پر بھروسہ کرتا ہے اور اسی کی ہدایات پر عمل کرتا ہے مگر دوسرے ڈاکٹروں کو برا بھلا
 کہتا نہیں پھرتا۔ آپ کسی ایک شخص کو وکیل بنا کر اپنا مقدمہ اس کے
 سپرد کر دیتے ہیں مگر دوسرے وکلاء سے لڑتے نہیں پھرتے۔ اجتہادی مختلف فیہ
 مسائل میں بھی ٹھیک یہی آپ کا طرز عمل ہونا چاہیے۔

جماعتوں کا غلو

ہماری دینی جماعتیں جو تعلیم دین یا ارشاد و تلقین یا دعوت و تبلیغ اور اصلاح
 معاشرہ کے لیے قائم ہیں۔ اور اپنی اپنی جگہ مفید خدمات بھی انجام دے رہی ہیں۔
 ان میں بہت سے علماء و صلحاء اور مخلصین کام کر رہے ہیں۔ اگرچہ وہی متحد ہو کر تقسیم کار
 کے ذریعہ دین میں پیدا ہونے والے تمام رخنوں کے انسداد کی فکر اور امکانی حد تک
 باہم تعاون کرنے لگیں اور اقامت دین کے مشترک مقصد کی خاطر ہر جماعت دوسری
 کو اپنا دست و بازو سمجھے اور دوسروں کے کام کی ایسی ہی قدر کریں جیسی اپنے کام
 کی کرتے ہیں تو یہ مختلف جماعتیں اپنے اپنے نظام میں الگ رہتے ہوئے بھی اسلام کی

ایک عظیم الشان طاقت بن سکتی ہیں اور ایک عمل کے ذریعے اکثر دینی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہیں۔

مگر عموماً یہ سہوہ ہے کہ ہر جماعت نے جو اپنے سعی و عمل کا ایک دائرہ اور نظام عمل بنایا ہے، عملی طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدمتِ دین کو اسی میں منحصر سمجھ رہے ہیں، گویا ان سے نہ کہیں۔ دوسری جماعتوں سے اگر جنگِ جدل بھی نہیں تو بے قدری ضرور دیکھی جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ان جماعتوں میں بھی ایک قسم کا تشدد پایا جاتا ہے۔ غور کرنے سے اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقصد سب کا اگرچہ دین کی اشاعت، حفاظت اور مسلمانوں کی علمی، عملی، اخلاقی اصلاح ہی ہے لیکن اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے کسی نے ایک دارالعلوم قائم کر کے تعلیمِ دین کی اہم خدمت انجام دی۔ کسی نے ایک تبلیغی جماعت بنا کر رشد و ہدایت کا فرض ادا کیا۔ کسی نے کوئی انجمن بنا کر احکامِ دین کی نشر و اشاعت کا تحریری انتظام کیا۔ کسی نے فتوے کے ذریعے خلقِ خدا کو ضروری احکام بتانے کے لیے دارالافتاء قائم کیا۔ کسی نے اسلام کے حلال و حرام، تلبیسات کے جواب کے لیے تصنیفات کا یا ہفتہ واری یا ماہواری رسالہ اخبار کا سلسلہ جاری کیا، یہ سب کام اگرچہ صورت میں مختلف ہیں، مگر درحقیقت ایک ہی مقصد کے اجراء ہیں۔ ان مختلف محاذوں پر جو مختلف جماعتیں کام کریں گی یہ ضرور ہے کہ ہر ایک کا نظام عمل مختلف ہو گا اس لیے ہر جماعت نے بجا طور پر سہولت کے لیے اپنے مذاق اور ماحول کے مطابق ایک نظام عمل اور اس کے اصول و قواعد بنا رکھے ہیں اور ہر جماعت ان کی پابند ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اصل مقصد تو منصوص اور قطعی اور قرآن و سنت سے ثابت ہے اس سے انحراف کرنا قرآن و سنت کی حدود سے نکلنا ہے لیکن یہ اپنا بنایا ہوا نظام عمل اور اس کے تنظیمی اصول و قواعد منصوص ہیں نہ ان کا اتباع از روئے شرع ہر ایک کے لیے ضروری ہے بلکہ جماعت کے ذمہ داروں نے سہولتِ عمل کے لیے ان کو اختیار کر لیا ہے۔ ان میں حسبِ ضرورت تبدیلیاں وہ خود بھی کرتے رہتے ہیں اور حالات اور ماحول بدلنے پر اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا نظام عمل

بنالینا بھی کسی کے نزدیک ناجائز یا مکروہ نہیں ہوتا مگر اس میں علمی غلو تقریباً ہر جماعت میں یہ پایا جاتا ہے کہ اپنے مجوزہ نظام عمل کو مقصد منصوص کا درجہ دے دیا گیا۔ جو شخص اس نظام عمل میں شریک نہیں اگرچہ مقصد کا کتنا ہی عظیم کام کر رہا ہو اس کو اپنا بھائی اپنا شریک کار نہیں سمجھا جاتا۔ اور اگر کوئی اس نظام عمل میں شریک تھا پھر کسی وجہ سے اس میں شریک نہ رہا تو عملاً اسے اصل مقصد اور دین سے منحرف سمجھ لیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے جو دین سے انحراف کرنے والوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اگرچہ وہ اصل مقصد یعنی اقامت دین کی خدمت پہلے سے بھی زیادہ کرنے لگے۔ اس غلو کے نتیجے میں وہی تحریک و تعصب اور گردہ بندی کی آفتیں اچھے خاصے دیندار لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہیں جو جاہل عصیتموں میں مبتلا لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔

پیغمبرانہ دعوت کو نظر انداز کرنا

ہماری تبلیغ و دعوت اور اصلاحی کوششوں کو بے کار کرنے اور تفرقہ اور جنگ جہل کی خلیج کو وسیع کرنے میں سب سے زیادہ دخل اس کو ہے کہ آج کل کے اہل زبان اور اہل قلم علماء نے عموماً دعوت و اصلاح کے پیغمبرانہ طریقوں کو نظر انداز کر کے صحافیانہ زبان اور فقرے چُست کرنے ہی کو بات میں وزن پیدا کرنے اور موثر بنانے کا ذریعہ سمجھ لیا ہے۔ اور تجربے و مشاہدے سے واضح ہے کہ یہ ایک ایسا منحوس طریقہ ہے کہ اس خطا کار یا گمراہ کی اصلاح کی کبھی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ یہ طریق کار ان کو ضد اور ہٹ دھرمی پیدا اور زیادہ مضبوط کر دیتا ہے اور اصلاح کے بجائے دلوں میں دشمنی کے بیج بوتا ہے اور عداوت کی آگ بھڑکاتا ہے۔

ہاں اپنے ہوا خواہوں اور معتقدین کے لیے کچھ دیر کا سامان تفریح ضرور ہو جاتا ہے اور ان کی داد و سخن مینے سے لکھنے والے بھی کچھ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم نے دین کی بڑی اچھی خدمت کی ہے۔

لیکن جو لوگ اس مضمون کے مخاطب ہوتے ہیں، ان کے دلوں سے پوچھیے کہ اگر کسی وقت ان کو اس بات کے حق ہونے کا یقین بھی ہو جائے تو یہ فقرہ بازی اور تمسخر و استہزاء کا طریق اس کو حق کی طرف آنے سے مانع نہیں بن جاتا؛ اور انہیں ہمیشہ کے لیے اس داعی کا دشمن نہیں بنا دیتا ہے۔

پیغمبرانہ دعوت کے عناصرِ اربعہ

اس کے بالمقابل اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور پیغمبروں کی دعوت کا طریقہ ملاحظہ فرمایا جائے تو اس کے الفاظ سادہ مگر عام فہم انسانی ہمدردی سے لبریز اور نرم ہوتے ہیں۔ وہ مخالفین کی سخت ترین بدکلامی سُن کر بھی جواب سادہ اور نرم دیتے ہیں فقرے نہیں کہتے دل میں ہمدردی کا جذبہ ہوتا ہے کہ کسی طرح یہ حق بات قبول کر لے۔ اس کے لیے حکمت کے ساتھ تدبیریں کرتے ہیں۔

پیغمبرانہ دعوت کی رُوح قرآن کے ایک لفظِ نذیر سے سمجھی جاسکتی ہے جو ہر پیغمبر کے لیے قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے۔

قرآن کریم میں جا بجا ان کو بشیر و نذیر کہا گیا ہے۔ لفظ نذیر کا ترجمہ اُردو میں ڈرانے والے کا کیا جاتا ہے۔ مگر ڈرانے کا لفظ نذیر کا پورا مفہوم ادا نہیں کرتا۔ اُردو زبان کی تنگی کی وجہ سے اس ترجمہ کو اختیار کر لیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈرانے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ چور ڈاکو کا بھی ڈرانا ہے۔ درندہ اور دشمن کا بھی ڈرانا ہے اور ایک شفیق باپ بھی اپنے بچہ کو سانپ، بچھو، زہر آراگ سے ڈراتا ہے پہلی قسم نری تخلیف ہے نذارت و انذار نہیں، چور، ڈاکو یا دشمن اور درندہ کو نذیر نہیں کہا جائے گا اور دوسری قسم جو مہربان باپ کی طرف سے ہے وہ ڈرانا شفقت و ہمدردی کی بنا پر نضر اور تکلیف دہ چیزوں سے ڈرانے والے کو نذیر کہا جاتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے لیے نذیر کا لفظ استعمال فرما کر ان کی تبلیغ و تعلیم کی روح کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ وہ صرف کوئی پیغام ہی نہیں پہنچاتے بلکہ حکمت اور ہمدردی

برفق ولین و حسن خطاب یعنی مجادلہ بھی نرمی، خیر خواہی اور حسن خطاب کے ساتھ ہونا چاہیے اور تفسیر منظرہ میں فرمایا کہ مجادلۃ بالتی ہی احسن یہ ہے کہ اس میں اپنا عقیدہ اٹارنا یا اپنے نفس کی بڑائی پیش نظر نہ ہو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کلمہ حق کو بلند کرنے کے لیے جہاد اور مجادلہ بالتی ہی احسن صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ غیر مسلموں سے مجادلہ کی لزبت آئے تو اس میں بھی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اسی کی ہدایت کی گئی ہے۔ ایک آیت میں ارشاد ہے: وَلَا تَجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ یعنی انکار اہل کتاب سے مجادلہ کی لزبت آئے تو وہ بھی بالتی ہی احسن۔ یعنی نرمی، خیر خواہی اور حسن خطاب کے ساتھ ہونا چاہیے۔

انبیاء علیہم السلام کا اسوۂ حسنہ

انبیاء علیہم السلام کے دعوت و اصلاح کے واقعات جو قرآن و حدیث میں بے شمار آئے ہوئے ہیں ان میں ایک ایک کو دیکھئے تو پوری عمر کی کوششوں کو اسی انداز پر پائیے گے۔

حضرت نوح علیہ السلام سو پچاس نہیں بلکہ نو سو برس تک جس قوم کو دعوت دیتے رہے اور ہمدردی و خیر خواہی سے سمجھاتے رہے، اس کے باوجود جب ان کی قوم نے سختی اور بے تہذیبی کا معاملہ کیا ان کو بے وقوف بنایا تو آپ کو معلوم ہے کہ اس رسول مقبول نے کیا جواب دیا لِقَوْمٍ كَيْسٍ بِي سَفَاهَةٌ وَلَكِنَّتِي دَسْوَلٌ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ میرے بھائیو مجھ میں کوئی بے وقوفی نہیں بلکہ میں رب الغلین کی طرف سے رسول بنا کر تمہاری بھلائی کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

ہر درکائنات ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کے واقعات اسی طرز کے شاہد ہیں۔ ہر طرح کی ایذاؤں سے بچنے کے بعد بھی ظالموں سے انتقام لینے کا تو ذکر ہی کیا ہے ان کے لیے بھی دعائے خیر کی جاتی۔ اِهْدِنَا صِرَاطَكَ الَّذِي نَشْكُرُكَ لَا نَعْصِيكَ الْغَايِبُونَ جن حضرات علماء کو وراثت انبیاء کا کچھ حصہ ملا ہے، ان سب کا بھی دعوت و تبلیغ

میں یہی حال رہا ہے۔ آخری دور میں حضرت سیدہ اماعیلؓ شہیدہ کا واقعہ ہے کہ ہلی کی جامع مسجد سے دو غلط کرکے باہر آ رہے تھے کہ مسجد کی سیڑھیوں پر چند غلطوں نے راستہ روکا اور کہا ہم نے سنا ہے کہ آپ حرامی ہیں۔ مولانا نے نہایت طمانیت سے فرمایا کہ بھائی! آپ کو غلط خبر ملی ہے۔ میری والدہ کے نکاح کے گواہ اب تک زندہ موجود ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا مقصد صرف گالی دینا اور انہیں بچانا ہے مگر وارث انبیاء کا جو کام ہونا چاہیے وہ کیا، کہ ان کی گالی کو ایک مسئلہ بنا کر بات ختم کر دی۔

طریقِ نبوت اور ہم

حقیقت یہ ہے کہ دعوت و اصلاح کا کام انبیاء یا ان کے وارث ہی کر سکتے ہیں جو قدم قدم پر اپنا خون پیتے ہیں اور دشمن کی خیر خواہی اور ہمدردی میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی رفتار و گفتار میں کسی مخالف پر طعن و تشنیع کا شائبہ نہیں ہوتا، وہ مخالف کے جواب میں فقرے چست کرنے کی نکر نہیں کرتے، وہ ان پر الزام تراشی کا پہلو اختیار نہیں کرتے، اسی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ چند روز کی مخالفتوں کے بعد بڑے بڑے سرکشوں کو ان کے سامنے جھکنا پڑتا ہے، ان کی بات کو ماننا پڑتا ہے۔ آج افسوس یہ ہے کہ ہم اسوۂ انبیاء سے اتنی دُور جا پڑے کہ ہمارے کلام و تحریر میں ان کی کسی بات کا رنگ نہ رہا۔

آج کل کے مبلغ و مصلح کا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ مخالف پر طرح طرح کے الزام لگا کر اس کو رسوا کرے اور فقرے ایسے چست کرے کہ سُننے والا دل کو پکڑ کر رہ جائے، اسی کا نام آج کی زبان میں زبانِ دانی اور اُردو ادب ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ وَاٰتِیَ الْیَسْرِ رَاجِعُوْنَ ۝

اللہ تعالیٰ تو اپنے انبیاء کو جب منقامِ دعوت پر کھڑا کرتے ہیں تو سوائے و ہارون علیہما السلام جیسے اولوا العزم پیغمبروں کو فرعون جیسے سرکش کافر کی طرف بھیجنے کے وقت یہ ہدایت نامہ دے کر بھیجتے ہیں:

قَوْلًا لَدَ قَوْلًا لَيْتًا لَعَلَّهٗ
 یتذکر اویختنی
 ”فرعون سے بات نرم کر دو۔ شاید راستہ پر
 آجائے اور اللہ تعالیٰ سے ڈر جائے۔“

آج ہمارے علماء اور صلحین و مبلغین میں کوئی حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام
 سے زیادہ ہادی اور رہبر نہیں ہو سکتا اور ان کے مخاطب فرعون سے زیادہ گمراہ نہیں
 ہو سکتے تو ان کے لیے کیسے روا ہو گیا کہ جس سے ان کا کسی رائے میں اختلاف ہو جائے
 تو اس کی پگڑی اچھا لیں اور ٹانگ کھینچنے کی فکر میں لگ جائیں اور استہزاء و تمسخر کے
 ساتھ اس پر فقرے چست کریں۔ اور پھر دل میں خوشش ہوں کہ ہم نے دین کی بڑی
 خدمت انجام دی ہے۔ اور لوگوں سے اس کے متوقع رہیں کہ ہماری خدمات کو سراہیں
 اور قبول کریں۔

میری نظر میں اس وقت یہ تین اسباب ہیں جو مسلمانوں کا شیرازہ بندھنے
 نہیں دیتے۔ ہر اجتماع کے نتیجے میں افتراق، اور تنظیم کے نتیجے میں تفریق، ہر اصلاح
 کے نتیجے میں فساد اور ہر دعوت کے نتیجے میں نفرت، ہمارے سامنے آتی ہے۔ کاش
 ہم مل کر سوچیں اور دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کی فکر کریں۔ کیونکہ اصل
 مرض یہی ہے کہ حب مال و جاہ، حسد و بغض کی نجاستوں سے اپنے قلوب پاک نہیں،
 ہمیں اس پر بڑا ناز ہے کہ ہم چوری، رشوت، سود، شراب، رقص و سرود اور سینما
 سے پرہیز کرتے ہیں اور نماز روزے کے پابند ہیں۔ لیکن خطرہ یہ ہے کہ کہیں ہماری
 یہ نماز روزہ کی پابندی اور سود، شراب، رقص و سرود سے پرہیز کہیں ایسا تو نہیں
 کہ صرف اپنی مولوی گری کے پیشہ کی خاطر ہو۔ کیونکہ اس پیشہ میں ان چیزوں کی کھپت
 نہیں ورنہ اگر ہم ان چیزوں سے خالص خوفِ خدا کی بنا پر بچے ہوتے تو حب مال و
 جاہ، حسد و بغض، کبر و بڑبڑ سے بھی بچے ہوتے۔ کیونکہ ان کی نجاست کچھ سود و شراب سے
 کم نہیں۔ مگر یہ باہنی گناہ ہمارے مجھے اور عمامے کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں اس لیے
 ان کی پرواہ نہیں ہوتی اور یہی وہ چیزیں ہیں جو دراصل سارے تفرقوں کی بنیاد
 ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان سب آفتوں سے بچنے کی توفیق کامل عطا فرمائے تاکہ قبول

ہو کر دعوت و اصلاح کا کام پیغمبرانہ جذبہ اور پیغمبرانہ آداب کے ساتھ لے کر کھڑے ہو جائیں۔

خلاصہ کلام

اہل نظر و فکر سے یہ بات مخفی نہیں کہ اس وقت دنیا کے ہر خطہ اور ہر ملک میں مسلمان جن مصائب اور آفات میں مبتلا ہیں، ان کا سب سے بڑا سبب آپس کا تفرقہ اور خانہ جنگی ہے۔ ورنہ عددی اکثریت اور مادی اسباب کے اعتبار سے پوری تاریخ اسلام میں کسی وقت بھی مسلمانوں کو اتنی عظیم طاقت حاصل نہیں تھی جتنی آج ہے۔ اور اس تفرقہ کے اسباب پر جب غور کیا جاتا ہے تو اس کا سبب خدا اور آخرت سے غفلت اور دوسری قوموں کی طرح صرف دنیا کی چند روزہ مال و دولت اور عزت و جاہ کی ہوس بے لگام ہے۔ جو ہمارے معاشرہ میں کبھی سیاسی اقتدار کے لیے کش مکش، تجارتی اور صنعتی ریس، عہدوں اور منصبوں کی خاطر باہمی تصادم کی صورت میں ہمارے معاشرہ کو پارہ پارہ کرتی ہے اور کبھی مذہبی اور دینی نظریات کی آڑ اور مختلف نظاموں کے روپ میں ہمیں ایک دوسرے کے خلاف اہانت و استہزاء کا ذریعہ نہیں بن جاتی ہے وگرنہ اگر اجتہادی نظریات کے باہمی اختلاف کے باوجود صحابہ و تابعین کی طرح ہماری جگہ کا رخ صرف کفر و الحاد اور بے دینی کی طرف ہو جائے اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مختلف جماعتیں ایک صف اور ایک بنیان موصول نظر آئیں۔۔۔۔۔

ڈیمہ دار علماء سے دردمندانہ گزارش

سیاسی اور اقتصادی میدان اور اعزاز و منصب کی دوڑ میں بے اعتدالیوں کی روک تھام تو سہرہ دست ہمارے بس میں نہیں لیکن خود دین و مذہب کے لیے کام کرنے والی جماعتوں کے نظریاتی اور نظامی اختلافات اشتراک مقصد کی خاطر معتدل

کیے جاسکتے ہیں۔ اگر ہم اسلام کے بنیادی اصول کی حفاظت اور الحاد بے دینی کے سیلاب کی مدافعت کے اہم مقصد کو صحیح معنی میں مقصد اصلی سمجھ لیں تو یہ وہ لفظ وحدت ہے کہ جس پر مسلمانوں کے سارے فرقے ساری جماعتیں جمع ہو کر کام کر سکتی ہیں اور اسی وقت اس سیلاب کے مقابلہ میں کوئی مؤثر کام انجام پاسکتا ہے۔

لیکن حالات کا جائزہ یہ بتاتا ہے کہ یہ مقصد اصلی ہی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے اس لیے ہماری توانائی اور علم و تحقیق کا زور آپس کے اختلافی مسائل پر صرف ہوتا ہے۔ وہی ہمارے جلسوں، وعظوں، رسالوں اور اخباروں کا موضوع بحث بنتے ہیں ہمارے اس عمل سے عوام یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ دین اسلام صرف ان دو چیزوں کا نام ہے۔ اور جس رخ کو انہوں نے اختیار کر لیا ہے، اس کے خلاف کو گمراہی اور اسلام دشمنی سے تعبیر کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ہماری وہ طاقت جو کفر و الحاد اور بے دینی اور معاشرہ میں بڑھتی ہوئی بے حیائی کے مقابلہ پر خرچ ہوتی، آپس کی جنگِ جدل میں خرچ ہونے لگتی ہے۔ اسلام و ایمان ہمیں جس محاذ پر لڑنے اور قربانی دینے کے لیے پکارتا ہے۔ وہ محاذ دشمنوں کی یلغار کے لیے خالی پڑنا نظر آتا ہے۔ ہمارا معاشرہ سماجی برائیوں سے پُر ہے۔ اعمال و اخلاق برباد ہیں۔ معاملات و معاہدات میں فریب ہے۔ سود، قمار بازی، شراب، خنزیر، بے حیائی، بدکاری ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر چھا گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انبیاء کے جائز وارث اور ملک و ملت کے نگہبانوں کو آج بھی اپنے سے نظریاتی اختلاف رکھنے والوں پر جتنا غصہ آتا ہے اس سے آدھا بھی ان خدا کے باغیوں پر کیوں نہیں آتا۔ اور آپس کے نظریاتی اختلاف کے وقت جس جوشِ ایمانی کا اظہار ہوتا ہے وہ ایمان کے اس اہم محاذ پر کیوں ظاہر نہیں ہوتا۔ ہمارا زور زبان اور زور قلم جس شان سے اپنے اختلافی مسائل میں جہاد کرتا ہے اس کا کوئی حصہ سرحدات اور اصولِ ایمانی پر ہونے والی یلغار کے مقابلہ میں کیوں صرف نہیں ہوتا؟ مسلمانوں کو مرتد بنانے والی کوششوں کے بالمقابل ہم سب بنیانِ موصوں کیوں نہیں بن جاتے؟

آخر ہم اس پر غور کیوں نہیں کرتے کہ بعثتِ انبیاء اور نزولِ قرآن کا وہ مقصد عظیم جس نے دنیا میں انقلاب برپا کیا اور جس نے اولادِ آدم کو بہیمیت سے نکال کر انسانیت سے سرفراز کیا۔ اور جس نے ساری دنیا کو اسلام کا حلقہٴ گوشش بنایا، کیا وہ صرف یہی مسائل تھے جن میں ہم الجھ کر رہ گئے ہیں اور کیا دوسروں کو ہدایت پر لانے کا طریق اور پیغمبرانہ دعوت کا یہی عنوان تھا جو آج ہم نے اختیار کر رکھا ہے۔

اَلْغُرَبَاءُ يَلْتَمِئْنَ اِمْنًا اَنْ تَخْتَنِعَ كِیَا ب هِی دَقْت نِهَیْ اَیَا كِه اِیْمَانِ وَاللَّ
تَلُوْبُهُمْ لِيَذْكُرَ اللّٰهَ وَمَا كِه دَالِ اللّٰه كِه ذِكْرٍ اَوْ رَاس كِه نَازِل كِه
نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ۔ ہرے حق کی طرف جھک جائیں۔

آخر وہ کرنا وقت آئے گا جب ہم اپنے نظریاتی اور نظامی مسائل سے ذرا آگے بڑھ کر اصولِ اسلام کی حفاظت اور گہڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح کو اپنا اصلی فریضہ سمجھیں گے۔ ملک میں عیسائیت اور کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی نذر لیں گے قادیانیت کے انکارِ حدیث اور تحریفِ دین کے لیے قائم شدہ اداروں کا پیغمبرانہ و خود اصلاح کے ذریعے مقابلہ کریں گے۔

اور اگر ہم نے یہ نہ کیا اور محشر میں ہمارے اوصیٰ اور نبی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے یہ سوال فرمایا کہ میری شریعت اور میرے دین پر حملے ہو رہے تھے۔ اسلام کے نام پر کفر پھیلا جا رہا تھا۔ میری امت کو میرے دشمنوں کی امت بنانے کی کوشش مسلسل جاری تھی، قرآن و سنت کی کھلے طور پر تحریف کی جا رہی تھی، خدا اور رسول کی نافرمانی اعلانیہ کی جا رہی تھی تو تم مدعیانِ علم کہاں تھے؟ تم نے اس کے مقابلے پر کتنی محنت اور قربانی پیش کی؟ کتنے جھکے ہوئے لوگوں کو راستے پر لگایا۔ تو آج ہمیں سوچ لینا چاہیے کہ ہمارا جواب کیا ہوگا۔

راہِ عمل

اس لیے ملت کا درد اور اسلام و ایمان کے اصول و مقاصد پر نظر رکھنے والے حضرات علماء سے میری درد مندانه گزارش یہ ہے کہ مقصد کی اہمیت اور نزاکت

کو سامنے رکھیں۔ سب پہلے تو اپنے دلوں میں اس کا عہد کریں کہ اپنی علمی و عملی حیثیت اور زبان و قلم کے زور کو زیادہ سے زیادہ اس محاذ پر لگائیں گے جس کی حفاظت کے لیے قرآن و حدیث آپ کو بلا رہے ہیں۔

(۱) علماء کرام! اس بات کا عہد بھی کیجئے اور فیصلہ بھی کہ اس کام کے لیے اپنے موجودہ مشاغل میں سے سب سے زیادہ وقت نکالیں گے (۲) دوسرے یہ کہ آپس کے نظریاتی اور اجتہادی اختلاف کو مرنے اپنے حلقہٴ درس اور تصنیف و تالیف اور فتوے تک محدود رکھیں گے۔ عوامی جلسوں، اخباروں، اشتہاروں، باہمی مناظروں اور جھگڑوں کے ذریعہ ان کو نہ اچھالیں گے، ان حلقوں میں بھی پیغمبرانہ اصول و دعوت و اصلاح کے تابع و خراش عنوان اور وطن و تشیع، استہزاء و تمسخر اور صحی فیانہ فقرہ بازی سے گریز کریں گے (۳) تیسرے یہ کہ معاشرہ میں پھیلی ہوئی بیماریوں کی اصلاح کے لیے دلنشین عنوان اور مشفقانہ لب و لہجہ کے ساتھ کام شروع کر دیں گے۔ (۴) چوتھے یہ کہ الحاد و بے دینی اور تحریف قرآن و سنت کے مقابلہ کے لیے پیغمبرانہ اصول و دعوت کے تحت حکیمانہ تدبیروں، مشفقانہ و ناصحانہ بیانیوں اور دلنشین دلائل کے ذریعہ مجاہدہ بالستی ہی احسن کے ساتھ اپنے زور زبان اور زور قلم کو وقف کر دیں گے۔

یہیں جو کچھ کہہ گیا ہوں افسوس کہ نہ میرا منصب تھا نہ علماء کرام کے سامنے مجھے ایسی جرات کرنا چاہیے تھی مگر دکھی دل کے کچھ کلمات ہیں جو زبان پر آگئے۔ میرے محترم بزرگ مجھے معاف فرمائیں اور اگر ان باتوں میں کوئی مفید پہلو ہے تو وہ خود ان کا اپنا کام ہے اس کو اختیار فرمائیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر حضرات علماء اس طرف متوجہ ہو گئے اور کام شروع کیا تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ اِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ — یعنی اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا، آنکھوں سے پورا ہوتا ہوا مشاہدہ کریں گے۔

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَالْيَسِّرُ لِلْيَسْرِ —

اختلافاتِ اُمت

اور

اُن کا حل

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے ایک دوسرے موقع پر
 " اختلافاتِ اُمت اور اُن کا حل " کے عنوان سے تقریر
 فرمائی جو فی الحقیقت یہ " وحدتِ اُمت " کے تمہ کی حیثیت
 رکھتی ہے۔ اس مناسبت سے اس تقریر کو بھی " وحدتِ
 اُمت " کے خطاب کے ساتھ ہی شائع کیا جا رہا ہے، تاکہ
 بات مکمل ہو جائے اور مرض و علاج دونوں کی تفصیلات
 یکے وقت سامنے آجائیں۔

(ط - ۱)

اختلافاتِ اُمت اور اُن کا حل

شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ مالک کی چار سالہ جیل سے رہائی کے بعد دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے تو علماء کے ایک مجمع کے سامنے آپ نے ایک اہم بات ارشاد فرمائی۔

جو لوگ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے واقف ہیں وہ اس سے بھی بے خبر نہیں ہیں کہ ان کی یہ قید و بند عام سیاسی لیڈروں کی قید نہ تھی۔ جنگِ آزادی میں اس درویش کی ساری تحریکات صرف رضائے حق سبحانہ و تعالیٰ کے لیے امت کی صلاح و فلاح کے گرد گھومتی تھیں مسافرت اور انتہائی بے کسی کے عالم میں گرفتاری کے وقت جملہ جو ان کی زبانِ مبارک پر آیا تھا، ان کے عزم اور مقاصد کا پتہ دیتا ہے فرمایا:

الحمد للہ بمصیبتہ گرفتارم نہ بمعصیتہ

جیل کی تنہائی میں ایک روز بہت مغموم دیکھ کر بعض رفقاء نے کچھ تسلی کے الفاظ کہنا چاہے تو فرمایا "اس تکلیف کا کیا غم ہے جو ایک دن ختم ہو جانے والی ہے غم اس کا ہے کہ یہ تکلیف و محنت اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول ہے یا نہیں۔"

مالٹا کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات بعد عشاء دارالعلوم میں تشریف فرما تھے۔ علماء کا بڑا مجمع سامنے تھا اس وقت فرمایا کہ ہم نے تو مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں۔ یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمتن گوشس ہو گیا کہ اس استادِ علم دارویش نے اسی سال علماء کو درس دینے کے بعد آخر عمر میں جو سبق سیکھے ہیں وہ کیا ہیں۔ فرمایا کہ:

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا فستردان کو چھوڑ دینا، دوسرے ان کے آپس کے

اختلافات اور خانہ جنگی، اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معنایاً عام کیا جائے۔ بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر سستی بستی میں قائم کیے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے، اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔

تباہ امت نے ملتِ مروجہ کے مرض کی جو تشخیص اور تجویز فرمائی تھی، باقی آئامہ زندگی میں ضعف و علالت اور بھوم مشاغل کے باوجود اس کے لیے سعی و پیہم فرمائی بذاتِ خود درس قرآن شروع کرایا۔ جس میں تمام علمائے شہر اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے علماء بھی شریک ہوتے تھے۔ عوام بھی اس ناکارہ کو اس درس میں شرکت کا شرف حاصل رہا ہے۔ مگر اس واقعے کے بعد حضرت کی عمر ہی گنتی کے چند آتام تھے۔

ع آں قدح بہ شکست و آں ساقی نما ند

آج بھی مسلمان جن بلاؤں میں مبتلا اور جن حوادث و آفات سے دوچار ہیں، اگر بصیرت سے کام لیا جائے تو ان کے سب سے بڑے سبب یہی دو ثابت ہوں گے۔ قرآن کو چھوڑنا اور آپس میں لڑنا۔ غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قرآن کو چھوڑنے ہی کا لازمی نتیجہ ہے۔ قرآن پر کسی درجے میں بھی عمل ہونا تو خانہ جنگی یہاں تک نہ پہنچتی۔

اختلاف رائے کے حدود

اختلاف رائے کچھ مذموم نہیں، اگر اپنی حدود کے اندر ہو۔ انسان کی فطرت میں اس کے پیدا کرنے والے نے عین حکمت کے مطابق ایک مادہ غصہ اور مدافعت کا بھی رکھا

ہے اور وہ انسان کی بقا و ارتقاء کے لیے ضروری ہے۔ مگر یہ مادہ دشمن کی مدافعت کے لیے رکھا ہے۔ اگر اس کا رخ دوسری طرف ہو جائے، خواہ اس کے لیے دشمن کو پہچاننے اور متعین کرنے میں غلطی ہو گئی ہو یا کسی دوسری وجہ سے۔ بہر حال جب دشمن کا رخ بدلے گا تو یہ خود اپنی تباہی کا ذریعہ بنے گا۔ اسی لیے قرآن کریم نے مومن کے لیے پوری وضاحت کے ساتھ اس کا رخ متعین فرما دیا ہے۔

اِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا، شَيْطَانُ مَهْتَابٍ
ہے۔ اس کو ہمیشہ دشمن سمجھتے رہو۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ مومن کے غصے اور لڑائی کا مصروف صحیح صرف شیطان اور شیطان طاقتیں ہیں۔ جب اس کی جنگ کا رخ اس طرف ہوتا ہے تو وہ جنگ قرآن کی اصطلاح میں جہاد کہلاتی ہے جو اعظم عبادت میں سے ہے۔ حدیث میں فرمایا ہے ذرۃ سنا مہا الجہاد یعنی اسلام میں سب سے اعلیٰ کام جہاد ہے۔ لیکن اگر اس جنگ کا رخ ذرا اس طرف سے ہٹا تو یہ جہاد کے بجائے فساد کہلاتی ہے جس سے بچانے کے لیے اللہ کے رسول اور کتا میں آئی ہیں۔ شکل و صورت کے اعتبار سے جہاد اور فساد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ کانٹا، جہاں سے یہ لٹنیں بدلتی ہیں صرف یہ ہے کہ اس کا رخ شیطان اور شیطانی طاقتوں کی طرف ہے تو جہاد ہے ورنہ فساد۔ دو قومی نظریہ، جس نے پاکستان بنوایا اسی مجال کی عملی تفصیل تھی کہ کلمہ اسلام کے مننے والے ایک متحد قوم ہیں اور زمانے والے دوسری قوم۔ ان کے جہاد کا رخ اس طرف ہونا چاہیے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے جہاد کے فرض ہونے کی ایک حکمت یہ بھی بیان فرمائی کہ قہر و غضب اور مدافعت کا مادہ، جو انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے جب جہاد کے ذریعے اپنا صحیح مصروف پالیتا ہے تو آپس کی خانہ جنگی اور فساد سے خود بخود نجات ہو جاتی ہے ورنہ اس کی مثال ایسی ہوتی ہے کہ جس چھت میں بارش کا پانی نکلنے کا راستہ پنلوں کے ذریعے نہ بنایا جائے تو پھر یہ پانی چھت کو توڑ کر اندر آتا ہے۔

صلح اور جنگ، کس سے

آج اگر غور کیا جائے تو پورے عالم اسلام پر یہی مثال صادق آتی ہے شیطان اور شیطانی تعلیم، کفر و الحاد، خدا اور رسول سے بغاوت، انجاشی و عیاشی سے طبیعتیں مانوس ہو رہی ہیں۔ ان کی نفرت دلوں سے نکل چکی ہے اس پر کسی کو غصہ نہیں آتا۔ انسانی رواداری، اخلاق، مروت کا سارا زور کفر و الحاد اور ظلم کی حمایت میں صرف ہوتا ہے۔ نفرت، بغاوت، عداوت کا میدان خود اپنے اعضاء و جوارح کی طرف ہے۔ آپس میں دراذر اسی بات پر جھگڑا لڑائی ہے چھوٹا سا نقطہ اختلاف ہو تو اس کو بڑھا کر پہاڑ بنا دیا جاتا ہے۔ اجارات و رسائل کی غذا یہی بن کر رہ گئی ہے۔ دونوں طرف سے اپنی پوری توانائی اس طرح صرف کی جاتی ہے کہ گویا جہاد ہو رہا ہے۔ دو متخارب طاقتیں لڑ رہی ہیں اور کوئی خدا کا بندہ اپنی طرف نظر کر کے نہیں دیکھتا کہ صلح

ظالم جو بہہ رہا ہے وہ تیرا ہی گھرنہ ہو

سیاستِ ممالک سے لے کر خاندانی اور گھریلو معاملات تک سب میں اسی کا مظاہرہ ہے۔ جہاں دیکھو اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ کا سبق پڑھنے والے آپس میں گتقم گتھا ہیں۔ قرآن حکیم نے جہاں عضو و درگزر حلم و بردباری کی تلقین کی تھی وہاں جنگ ہمدردی ہے اور جس محاذ پر جہاد کی دعوت دی تھی وہ محاذ دشمنوں کی یلغار کے لیے خالی پڑا ہے۔ فَا لِيِ اللّٰهِ الْمَشْرِئُكِي وَاِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ اسمبلیوں، کونسلوں، میونسپل بورڈوں کی نشست، حکومت، کے عہدوں اور ملازمتوں کی دوڑ، صنعت و تجارت میں مقابلہ اور کمپیٹیشن، جائیدادوں اور زمینداروں کی کش مکش جہاں خالص اپنے حقوق کی جنگ ہے جس کو چھوڑ بیٹھنا سب نزدیک ایثار اور اعلیٰ اخلاق کا ثبوت ہے، وہاں کوئی ایک اپنی جگہ سے سرکنے کو تیار نہیں۔ دین و مذہب کے نام پر کام کرنے والوں کی اول تو تعداد ہی کم ہے اور جو بے وہ ہو مآقرآن و سنت کی بنیادی تعلیمات سے انماض کر کے جزوی اور فروعی

مسائل میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ معرکہ جدال بنا ہوا ہے جس کے پیچھے غیبت، جھوٹ، ایذا، مسلم، افراء و بہتان، تمسخر و استہزاء جیسے تفتق علیہ کبیرہ گناہوں کی بھی پرواہ نہیں کی جاتی۔ دین کے نام پر خدا کے گھروں میں جدال و قتال اور لڑائیاں ہیں۔ نوبت پولیس اور عدالتوں تک پہنچی ہوئی ہے۔

ان دینداروں کو خدا اور رسول پر استہزاء کرنے والوں، شراب پینے والوں، سود اور رشوت کھانے والوں سے وہ نفرت نہیں، جو ان مسائل میں اختلاف رکھنے والوں سے ہے۔

کوئی خدا کا بندہ اس پر نظر نہیں کرتا کہ اس کے مثبت و منفی دونوں پہلوؤں میں کوئی بھی کسی کے نزدیک ایسا نہیں جس کیلئے مسلمانوں سے جنگ کرنا جائز ہو۔ جس کے لیے دوسروں کی غیبت و بہتان، تہلیل و تحقیر روا ہو۔

اصلاح حال کی ایک غلط کوشش

ہمارے تو تعلیم یافتہ روشن خیال مصلحین کی توجہ جب اس باہمی اختلاف کے مہلک نتائج کی طرف جاتی ہے اور اس کے علاج کی فکر ہوتی ہے تو ان کے خیال میں ساری خرابیاں صرف ان اختلافات میں نظر آتی ہیں جو دین و مذہب کے نام پر سامنے آتے ہیں۔ اور وہ صرف اسی اختلاف کو مٹانے کے لیے علاج سوچتے ہیں۔ وہ اس وقت ان سب لڑائیوں کو محمول جانتے ہیں جو خالص نفسانی اور ذاتی غرض کے لیے لڑی جا رہی ہیں جن کے لیے ایک دوسرے کی جان، آبرو اور مال سب کچھ حلال سمجھ لیا جاتا ہے جس کے پیچھے پورے ملک میں باہمی منافرت کے سیلاب امنڈتے ہیں مگر ان کو چونکہ نئی تہذیب و شرافت کا نام دے دیا ہے، اس لیے نہ وہ قوم کے لیے کوئی مرض رہا نہ اس کا علاج سوچنے کی ضرورت رہی۔ اختلاف و لڑائی میں صرف ملّا بد نام ہے۔ اسی کا علاج زیر غور ہے۔ حالانکہ دین و مذہب کے نام پر جو اختلافات ہیں، اگر غور کیا جائے تو ان کی خرابی صرف حد و دے

تجاوز کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے ورنہ وہ کوئی برادری کا نونہ نہیں بن سکتے۔ وہ اپنے ذاتی حقوق نہیں چھینیں ایثار کیا جاسکے۔ بلکہ قرآن و سنت کی تعبیر کے اختلافات ہیں جن کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔

ہمارے بعض روشن خیال مصلحین نے سارا فساد انہیں اختلافات میں منحصر سمجھ کر اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ فرستہ وارانہ اختلافات کو ہٹا کر سب کا ایک نیا اور مشترک مذہب بنا لیا جائے۔ پوری قوم کا وہی ایک مذہب ہو، تاکہ اختلاف کی بنیاد ہی ختم ہو جائے۔

مگر یہ بات مذہبی مسائل میں عقلاً صحیح ہے نہ عملاً ممکن۔ ہاں خالص دنیوی معاملات جن میں جھگڑا ذاتی حقوق ہی کا ہو، ہاں اپنے اپنے مطالبات کو نظر انداز کر کے ایسی صلح کی جاسکتی ہے، اس لیے باہمی جنگ و جدل کا علاج یہ نہیں کہ اختلاف رائے کو مٹا کر سب کو ایک نظریے کا پابند کر دیا جائے۔

اختلاف رائے اور جھگڑے فساد میں فرق

اہل عقل و بصیرت پر مخفی نہیں کہ دینی اور دنیوی دونوں قسم کے معاملات میں بہت سے مسائل ایسے آتے ہیں جن میں رائیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ ان میں اختلاف کرنا عقل و دیانت کا عین مقتضی ہوتا ہے۔ ان میں اتفاق صرف دو صورتوں سے ہو سکتا ہے۔ یا تو مجمع میں کوئی اہل بصیرت اور اہل رائے نہ ہو۔ ایک نے کچھ کہہ دیا سب نے مان لیا۔ اور یا پھر جان بوجھ کر کسی کی رعایت و مروت سے اپنے ضمیر اور اپنی رائے کے خلاف دوسرے کی بات پر صناد کر دیا۔ ورنہ اگر عقل و دیانت دونوں موجود ہوں تو رائے کا اختلاف ضروری ہے اور یہ اختلاف کبھی کسی حال پر مضر بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ دوسروں کے لیے بصیرت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اسمبلیوں میں حروب اختلاف کو اسی بنیاد پر ضروری سمجھا جاتا ہے۔

قرآن و سنت کے جملات اور مبہمات کی تشریح و تعبیر میں اسی طرح کے اختلافات

کو "رحمت" کہا گیا ہے۔ جو اسلام کے عہدِ اول سے صحابہ و تابعین اور پھر ائمہ مجتہدین میں چلے آئے ہیں۔ ان مسائل میں جو اختلافات صحابہ کرام میں پیش آچکے ہیں، ان کو ملانے کے معنی اس کے سوا نہیں ہو سکتے کہ صحابہ کرام کی کسی ایک جماعت کو باطل قرار دیا جائے۔ جو نصوصِ حدیث اور ارشاداتِ قرآنی کے بالکل خلاف ہے اسی لیے حافظ شمس الدین ہی نے فرمایا ہے کہ جس مسئلے میں صحابہ کرام کے درمیان اختلاف ہو چکا ہے، اس کو بالکل ختم کر دینا ممکن نہیں۔

صحابہ اور ائمہ مجتہدین کا طرزِ عمل

اسی کے ساتھ صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے دور کی وہ تاریخ بھی سامنے رکھنا ضروری ہے کہ تعبیرِ کتاب و سنت کے ماتحت جو ان میں اختلافِ رائے پیش آیا ہے، اس پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں کہ اس نے جنگِ جدال کی صورت اختیار کی ہو۔ باہمی اختلافِ مسائل کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا اور تمام برادرانہ تعلقات قائم رہنا اس پوری تاریخ کا اعلیٰ شاہکار ہے۔ سیاسی مسائل میں متسلحہ صحابہ کا فتنہ، تکوینی حکمتوں کے ماتحت پیش آیا، آپس میں تلواریں بھی چل گئیں مگر عین اسی فتنہ کی ابتدا میں جب امام مظلوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زہنے میں مصور تھے، اور یہی باغی نمازوں میں امامت کراتے تھے، تو امام مظلوم نے مسلمانوں کو ان کی اقتدار میں نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی اور عام ضابطہ یہ بتا دیا کہ اذہم احسنوا فاحسن معہم و انہم اساءوا فاجتنب اساءتہم، یعنی جب وہ لوگ کوئی نیک کام کریں اس میں ان کے ساتھ تعاون کرو اور جب کوئی بُرا کام اور غلط کام کریں، اس سے اجتناب کرو۔ اس ہدایت کے ذریعے اپنی جان پر کھیل کر مسلمانوں کو قرآنی ارشادِ تَعَاوَنُوا عَلٰی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوا عَلٰی الْاِثْمِ وَالتَّعَدٰوٰنِ - کی صحیح تفسیر بتادی اور باہمی انتشار و افتراق کا دروازہ بند کر دیا۔ اور اسی فتنے کے آخر میں جب کہ حضرت علیؑ اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان

میدان جنگ گرم تھا، روم کی عیسائی سلطنت کی طرف سے موقع پا کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ بلانے اور ان کی مدد کرنے کا پیغام ملا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا جواب یہ تھا کہ ہمارے اختلاف سے دھوکہ نہ کھاؤ۔ اگر تم نے مسلمانوں کی طرف رخ کیا تو علی رضی اللہ عنہ کے لشکر کا پہلا سپاہی، جو تمہارے مقابلے کے لیے نکلے گا وہ معاویہ ہوگا۔ معلوم یہ ہوا کہ باہمی اختلاف جو منافقین کی گہری سازشوں سے تشدد کا مرض اختیار کر چکا ہے، اس میں بھی اسلام کے بنیادی حقائق کسی کی نظر سے اوجھل نہیں ہوئے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تعبیر کتاب سنت کے ماتحت اختلاف رائے جو صحابہؓ تابعین اور ائمہ مجتہدین میں رہا ہے تو وہ بلاشبہ رحمت ہی ہے۔ اس کا کوئی پہلو نہ پہلے مسلمانوں کے لیے مضر ثابت ہوا اور نہ آج ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ انہیں حدود کے اندر رہے، جن میں ان حضرات نے رکھا تھا کہ ان کا اثر نماز، جماعت، امامت اور معاشرت کے کسی محلے پر نہ پڑتا تھا۔

جدال اور اصلاح

مذہب کے نام پر دوسرے اختلافات قرونِ اولیٰ کے بعد بدعت و سنت اور دوسرے عنوانات سے پیدا ہوئے۔ بہت سے لوگوں نے قرآن و سنت کی تعبیر میں اصول صحیحہ کو چھوڑ کر ذاتی آراء کو امام بنا لیا اور نئے نئے مسائل پیدا کر دیے۔ یہ اختلافات بلاشبہ وہ تفریق و افتراق تھے، جن سے قرآن و سنت میں مسلمانوں کو ڈرا بایا گیا ہے۔ ان کے ختم یا کم کرنے کی کوشش بلاشبہ مفید تھی، مگر قرآن حکیم نے اس کا بھی ایک خاص طریقہ بتا دیا ہے جس کے ذریعے تفریق کی خلیج کم ہوتی چلی جائے بڑھنے نہ پائے۔ یہ وہ اصولِ دعوت الی الخیر ہیں جن میں سب سے پہلے حکمت و تدبیر سے اور پھر خیر خواہی ہمدردی اور نرم عنوان سے لوگوں کو قرآن و سنت کے صحیح مفہوم کی طرف بلانا ہے۔ اور آخر میں مجادلہ بالآئی ہی احسن یعنی حجت و دلیل کے ساتھ افہام و تفہیم کی کوشش ہے۔

افسوس ہے کہ آج کل عام اہل علم اور مصلحین نے ان اصول کو نظر انداز کر دیا۔

صرف جدال میں اور وہ بھی غیر مشروط انداز سے مشغول ہو گئے کہ اپنے حریف کا استہزاء و تمسخر اس کو زیر کرنے کے لیے جھوٹے پتے، ناجائز، جائز ہر طرح کے حربے استعمال کرنا اختیار کر لیا۔ جس کا لازمی نتیجہ جنگِ جدال اور جھگڑا فساد تھا۔

اختلافات کی خرابیوں کا وقتی علاج

آج جب کہ مسلمانوں کا تفرق انتہا کو پہنچا ہوا ہے، اپنی مزعومات کے خلاف کوئی کسی کی بات ماننے، بلکہ سُننے کے لیے بھی تیار نہیں اور کوئی ایسی قوت نہیں کہ کسی فریق کو مجبور کر سکے تو اس باہمی جنگِ جدال اور اس کے مہلک اثرات سے اسلام اور مسلمانوں کو بچانے کا صرف ایک راستہ ہے کہ فرقوں اور جماعتوں کے ذمہ دار ذرا اس پر غور کریں کہ جن مسائل میں ہم جھگڑ رہے ہیں کیا وہی اسلام کے بنیادی مسائل ہیں، جن کے لیے قرآن نازل ہوا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ آپ نے اپنی زندگی اُن کے لیے وقف کر دی۔ اور ان کے پیچھے ہر طرح کی قربانیاں دیں یا بنیادی مسائل اور قرآن اور اسلام کا اصلی مطالبہ کچھ اور ہے۔

جس ملک میں ایک طرف عیسائی مشنریاں اپنی پوری قوت اور چمک دمک کے ساتھ اس کو عیسائی ملک بنانے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔ ایک طرف کھلے بندوں خدا اور رسول اور ان کی تعلیمات کا مذاق اڑایا جاتا ہے، ایک طرف قرآن اور اسلام کے نام پر وہ سب کچھ کیا جا رہا ہے، جس کو دنیا سے مٹانے ہی کے لیے قرآن اور اسلام آیا تھا۔ اس جگہ صرف فروری مسائل اور ان کی تحقیق و تنقید و ترویج کی کوششوں میں اُلجھ کر ان بنیادی مہمات سے غفلت برتنے والوں سے اگر اللہ تعالیٰ در رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ مطالبہ ہو کہ ہمارے دین پر یہ افتادیں پڑ رہی تھیں، تم نے اس کے لیے کیا کیا، تو ہمارا کیا جواب ہوگا؟ مجھے یقین ہے کہ کوئی فرقہ، کوئی جماعت جب ذرا اپنے جھگڑوں سے بلند ہو کر سوچے گی تو اس کو اپنی موجودہ مصروفیات پر ندامت ہوگی۔ اور اس کی کوشش کا رخ بدلے گا۔ اس کے نتیجے میں باہمی آویزش یقیناً ختم ہوگی۔

میں اس وقت کسی کو یہ نہیں کہتا کہ وہ اپنے خیالات و مزعومات کو بدلے،
 گذارش صرف اتنی ہے کہ اپنی توانائی صرف کرنے کا عمل تلاش کر کے اس پر لگا دیں۔
 اور باہمی اختلافات کو صرف حلقہٴ درس یا فتویٰ یا تحقیقی رسائل تک محدود کر دیں اور
 ان میں بھی لب لہجہ قرآنی اصول دعوت کے مطابق زمر رکھیں۔ فقرے کسے اور دوسرے
 کی توہین کرنے کو زہر سمجھیں۔ ہمارے پبلک جلسے، اخبار، اشتہار بجائے باہمی آویزش
 کو ہوا دینے کے اسلام کے بنیادی اور متفق علیہ مسائل پر لگ جائیں۔ تو پھر ہماری جنگ
 جو فساد کی صورت اختیار کر چکی ہے، دوبارہ جہاد میں تبدیل ہو جائے گی اور اس کے
 نتیجے میں عوام کا رخ بھی باہمی جنگ بدل سے پھر کر دین کی صحیح خدمت کی طرف ہو جائیگا

صحیح اور غلط طرز عمل

بہت سے حضرات مسائل میں علماء کے اختلافات سے پریشان ہو کر پوچھا
 کرتے ہیں کہ ہم کدھر جائیں، جس کی تہ میں یہ پوشیدہ ہوتا ہے کہ اب ہم کسی کی نہ سنیں۔
 سب سے آزاد ہو کر جو سمجھ میں آئے کیا کریں، اور بنظاہر ان کا یہ معصومانہ سوال حق نجات
 نظر آتا ہے، لیکن ذرا غور فرمائیں تو ان کو اس کا جواب اپنے گرد و پیش کے معاملات میں
 خود ہی مل جائے گا۔

ایک صاحب بیمار ہوئے۔ ڈاکٹروں یا حکیموں کی آرا میں تشخیص و تجویز کے بارے
 میں اختلاف ہو گیا تو وہ کیا کرتے ہیں۔ یہی ناکوہ اُن ڈاکٹروں، حکیموں کی ڈگریاں معلوم
 کر کے یا پھر ان کے مطب میں علاج کرانے والے مریضوں سے یا دوسرے اہل تجربہ سے
 دریافت کر کے اپنے علاج کے لیے کسی ایک ڈاکٹر کو متعین کر لیتے ہیں۔ اسی کی تشخیص و
 تجویز پر عمل کرتے ہیں مگر دوسرے ڈاکٹروں حکیموں کو بُرا بھلا کہتے نہیں پھرتے۔ یہاں کسی
 کا یہ خیال نہیں ہوتا کہ معالجوں میں اختلاف ہے تو سب کو چھوڑو، اپنی آزاد رائے سے
 جو چاہو کرو۔ کیا یہی طرز عمل علماء کے اختلاف کے وقت نہیں کر سکتے۔

ایک مثال اور لیجئے۔ آپ کو ایک مقدمہ عدالت میں دائر کرنا ہے۔ قاضی جاننے

والے وکلاء سے مشورہ کیا۔ ان میں اختلاف رائے ہوا تو کوئی آدمی یہ تجویز نہیں کرتا کہ مقدمہ دائر کرنا ہی چھوڑ دے۔ یا پھر کسی وکیل کی نمائندگی نہ کرے۔ خود اپنی رائے سے جو سمجھ میں آئے وہ کرے۔ بلکہ ہوتا ہی ہے کہ مختلف طریقوں سے ہر شخص اتنی تحقیق کر لیتا ہے کہ ان میں کون سا وکیل اچھا جاننے والا اور قابل اعتماد ہے اس کو اپنا وکیل بنا لیتا ہے اور دوسرے وکیل کو باوجود اختلاف کے دشمن نہیں سمجھتا، بڑا بھلا نہیں کہتا، اس سے لڑتا نہیں پھرتا۔ یہی فطری اور سہل اصول اختلاف علماء کے وقت کیوں اختیار نہیں کیا جاتا۔ یہاں ایک بات یہ بھی سن لی جائے کہ بیماری اور مقدمے کے معاملات میں تو آپ نے کسی غلط ڈاکٹر یا غیر معتد وکیل پر اعتماد کر کے اپنا معاملہ اس کے حوالے کر دیا تو اس کا جو نقصان پہنچتا ہے وہ ضرور آپ کو پہنچے گا۔ مگر علماء کے اختلاف میں اس نقصان کا بھی خطرہ نہیں۔

حدیث میں ہے کہ کسی شخص نے اگر کسی عالم سے سوال کیا اور اس نے فتویٰ غلط دے دیا تو اس کا گناہ سوال کرنے والے پر نہیں، بلکہ فتویٰ دینے والے پر ہے۔ بشرط یہ ہے کہ سوال اس شخص سے کیا گیا ہو جس کا عالم ہونا آپ نے ایسی ہی تحقیق و جستجو کے ذریعے معلوم کیا ہو جو اچھے معالج اور اچھے وکیل کی تلاش میں آپ کیا کرتے ہیں، اپنی مقدمہ و بھر صحیح عالم کی تلاش و جستجو کر کے آپ نے ان کے قول پر عمل کر لیا تو آپ اللہ کے نزدیک بری ہو گئے۔ اگر اس نے غلط بھی بتا دیا ہے تو آپ پر اس کا کوئی نقصان یا الزام نہیں۔ ہاں یہ نہ ہونا چاہیے کہ ڈاکٹر کی تلاش میں تو اس کا ایم بی بی ایس ہونا بھی معلوم کریں اور یہ بھی کہ اس کے مطب میں کس طرح کے مریض زیادہ شفا یاب ہوتے ہیں، مگر عالم کی تلاش میں صرف عمامے، کُرتے اور داڑھی کو یا زیادہ سے زیادہ جلسے میں کچھ بول لینے کو معیار بنا لیں۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ اپنی ذمہ داری سنبھالیں۔ اس نے جواب میں کوئی غلطی کی تو آپ بھی اس کے مجرم قرار پائیں گے۔

باہمی جنگ و جدال کے دور کن ،

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آج مذہب کے نام پر جو جنگ و جدال کا بازار گرم ہے

اس کے دو رکن ہیں۔ ایک ہر فرقہ اور جماعت کے علماء دوسرے وہ عوام جو ان کے پیچھے چلنے والے ہیں۔

علماء اگر اپنی تحقیق و تنقید میں قرآنی اصول دعوت کے مطابق دوسرے کی تنقیص توہین سے پرہیز کرنے لگیں اور اسلام کے وہ بنیادی مسائل جن میں کسی فرقے کو اختلاف نہیں اور اسلام اور مسلمانوں پر جو مصائب آج آرہے ہیں وہ سب انہیں مسائل سے متعلق ہیں۔ اپنی کوششوں اور محنتوں کا رخ اس طرف پھیر دیں۔ اسی طرح عوام اپنی مقدور بھرپوری کوشش کر کے کسی صحیح عالم کا انتخاب کریں اور پھر اس کے بتائے طریقے پر چلتے رہیں۔ دوسرے علماء یا ان کے ماننے والوں سے لڑتے نہ پھریں تو بتلیے کہ ان میں اشکال کیا ہے۔ سارے فرقے اور ان کے اختلافات بدستور رہتے ہوئے بھی یہ باہمی جگہ جگہ مل سکتا ہے۔ جس نے آج مسلمانوں کو کسی کام کا نہیں چھوڑا صرف ذرا سی توجہ دینے اور دلانے اور طرز عمل بدلنے کی ضرورت ہے۔ کاش میری یہ آواز ان بزرگوں اور دوستوں تک پہنچے جو اس راہ میں کچھ کام کر سکتے ہیں۔ اور محض اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر اس ہمدردانہ دعوت کے لیے کھڑے ہو جائیں تو امت کی بہت سی مشکلات حل ہو جائیں۔ اور ہمارا پورا معاشرہ جن مہلک خرابیوں کی غار میں جا چکا ہے ان سے نجات مل جائے۔

عام سیاسی اور شخصی جھگڑوں کا علاج

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مذہبی معاملات میں جس شخص نے کوئی خاص رخ اختیار کر رکھا ہے، وہ اسی کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تلقین سمجھ کر اختیار کیے ہوئے ہے، خواہ وہ حقیقت کے اعتبار سے بالکل غلط ہی ہو مگر اس کا نظریہ کم از کم یہی ہے کہ وہ اللہ کا دین ہے۔ ان حالات میں اس کو ہمدردی اور نرمی سے اپنی جگہ افہام و تفہیم کی کوشش تو بجائے خود جاری رکھنا چاہیے لیکن جب تک اس کا نظریہ نہ بدلے اس کو دعوت نہیں دی جاسکتی کہ تم ایثار کر کے اپنا نظریہ چھوڑ دو اور صلح کر لو۔ ان سے

تو صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ اختلاف رائے کو اپنی حدود کے اندر رکھیں اور انہماق و تفہیم،
 قرآنی اصولِ حکمت و موعظت، مجادلہ بالحق ہی احسن کو نظر انداز نہ کریں مگر جن معاملہ
 کا تعلق صرف شخصی اور ذاتی حقوق اور خواہشات سے ہے، وہاں یہ معاملہ سہل ہے کہ
 جھگڑے سے بچنے کے لیے دوسرے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دے، اپنے حق سے دستبردار
 ہو جائے اور جو شخص ایسا کرے دنیا میں بھی اس کی عزت کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور
 جس مقصد کو چھوڑا ہے، وہ بھی دوسرے راستے سے حاصل ہو جاتا ہے اور آخرت میں
 تو اس کے لیے ایک عظیم نشارت ہے جس کا بدل پوری دنیا اور دنیا کی ساری حکومتیں
 اور نردو میں بھی نہیں ہو سکتیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اننا نعيبه بهبیت فخب
 ربيض الجنة لمن ترك المراء وهو محق" "میں ضامن ہوں اس شخص
 کو وسط جنت میں مکان دلانے کا جس نے حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دیا،"
 میں آخر میں پھر اپنے پہلے جملے کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ ہماری ساری خرابیوں کی بنیاد
 قرآن کو چھوڑنا اور آپس میں لڑنا ہے اور یہ آپس کی لڑائی بھی درحقیقت قرآنی تعلیمات کے
 نادر اقصیت یا غفلت ہی کا نتیجہ ہے۔ گروہی تعصبات نے یہ تخلف نظر دل سے اوجھل
 کر رکھے ہیں۔

دنیا میں صالحین کی اگرچہ قلت ضرور ہے مگر فدان نہیں۔ ان سوس ہے کہ ایسے
 مصلحین کا سخت قحط ہے جو گروہ پریش کے چھوٹے چھوٹے دائروں سے ذرا سزا کمال کر
 باہر دیکھیں اور اسلام اور قرآن ان کو کس طرف بلا رہا ہے، ان کی صدا سنیں۔
 اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کے راستے پر چلنے کی توفیق کامل عطا فرماویں۔

اللهم وفتنا لها تحب وترضى من القول
 والفعل والعمل والنية و صلى الله تعالى على
 خير خلقها و صفوة رسله محمد و آلہ وصحبہ اجمعين

بعثتِ انبیاء و رسل کا اسی مقصد — اور
 بعثتِ محمدی کی تمام تکمیلی شان — نیز
 انقلابِ نبوی کا اسی منہاج —

ایسے اہم موضوعات پر

ڈاکٹر اسرار احمد

کی

حَد درجہ جامع تصنیف

نبی اکرم کا مقصد بعثت

کا مطالعہ کیجئے

اعلیٰ سفید کاغذ • عمدہ طباعت • دیدہ زیب کتابت

مرکزی انجمن خدام القرآن • ۳۶ کے ماڈل ڈائن • لاہور

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان — اور — سرچشمہ یقین

قرآن حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکر امت کے فیہ عناصر میں تجدید ایمان کی ایک عمومی تحریک پہنچانے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃ ثانیہ — اور — غلبہ دین حق کے دور ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ